اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۱ء)

اِقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۱۱ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیشکش

مقالات عالمی اقبال سمینار منعقدہ ڈسمبر ۲۰۱۰ء

جلد اول

زیر اہتمام

اقبال اکیڈیمی ، حیدرآباد ، انڈیا

جلد (۲۰) شمارہ (۱)

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)
۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)
۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اکیڈیمی و ایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۷۵ روپے
ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۱۵۰ روپے
بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔ 500028
آندھرا پردیش (انڈیا)۔ فون: 66663950
e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، افضال الحق ندوی ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A
نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔ فون: 9392427796

ISBNNo: 81-86370-48-XI

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز لسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

(اقبال ریویو۔اپریل ۲۰۱۱ء)

۱	اداریہ	ادارہ	۴
۲	جشن اقبال ایک نظر میں	ڈاکٹر صابر علی سیوانی	۶
۳	اکیسویں صدی میں شاعر مشرق کی معنویت	ڈاکٹر یوسف آعظمی	۱۶
۴	مسلمانان ہند کا منفرد تجربہ اور آقبال	جناب محمد عبدالرحیم قریشی	۲۶
۵	تمل میں اقبال کے ترجمے اور اُن کی مقبولیت	پروفیسر مظفر شہ میری	۳۳
۶	ملیالم میں اقبالیات	جناب کے'پی' شمس الدّین	۴۳
۷	علامہ اقبال کی شہرہ آفاق نظموں ''شکوہ'' اور جواب شکوہ کی تشریحات بزبان ٹمل	جناب علیم صبا نویدی	۵۵
۸	کلام اقبال کا قرآنی اسلوب	ڈاکٹر جہاں آرا بیگم	۶۲
۹	اقبال اور صغریٰ ہمایوں مرزا	پروفیسر فاطمہ بیگم پروین	۷۷
۱۰	علامہ اقبال کے مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسم	پروفیسر مجید بیدار	۸۳
۱۱	اقبال کا تصورِ سرمایہ داری	جناب محمد آصف	۸۸
۱۲	English Section		

☆☆☆

پیش لفظ

اقبالؔ ریویو علمی اور ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک وقیع مقام حاصل کر چکا ہے جشن اقبالؔ دسمبر ۲۰۱۰ء پر پیش کردہ شمارہ کی ترتیب، تدوین اور اشاعت کو اہلِ فکر وعلم نے بے حد سراہا۔ قارئین کے اس جذبۂ مستحسن کا میں ممنون اور شکر گذار ہوں۔ زیرِ نظر شمارہ اسی جشن کے موقع پر منعقدہ عالمی اقبال سمینار میں پیش کئے گئے مقالات پر مشتمل پہلا حصہ ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے وسائل کی قلت کی پرواہ کئے بغیر ۲۱ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۱۰ء جشن اقبالؔ کے ضمن میں مختلف یادگار تقاریب کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا۔ افتتاحِ نمائش، افتتاحی اجلاس، جلسۂ عام اور موسیقی کے پروگرام سالار جنگ میوزیم کے خوبصورت تراب بھون ہال میں منعقدہ ہوئے جب کہ عالمی سمینار کے سات علمی مذاکرات کا انعقاد مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں عمل میں آیا۔ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۰ء کی شام ۷ بجے عزت مآب جناب کے۔ رحمٰن خان صاحب، ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا حکومت ہند نے شاندار ''نمائش اقبالیات'' کا افتتاح کیا اور ''جشن اقبال'' کی افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی۔ اس جشن میں شرکت کے لئے بیرون ہند سے پروفیسر علی رضا قضوے (ایران) پروفیسر جہاں اوزڈیمر (ترکی)، ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن)، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) تشریف لائے۔ پاکستان سے ناظم اقبال اکیڈیمی پروفیسر محمد سہیل عمر، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور دیگر دانشوران کرام کی شرکت متوقع تھی۔ لیکن ویزا حاصل کرنے میں حائل رکاوٹوں کے باعث وہ شریک نہ ہو سکے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے ڈاکٹر عبدالصمد صمدانی (کیرالہ) ایم پی، جناب عزیز پاشاہ (ایم پی) پروفیسر شیو۔ کے۔ کمار (جنھیں اقبال کو دیکھنے کا شرف حاصل ہے)، ڈاکٹر منظر حسین (رانچی)، ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری (کالی کٹ)، جناب علیم صبا نویدی، ڈاکٹر عبدالغفور، جناب کے پی شمس الدین (کیرالہ)، ڈاکٹر اوصاف احمد، جناب محمد آصف، پروفیسر عبدالباری، ڈاکٹر ظفر محمود (آئی۔ اے۔ یس) (دہلی)، پروفیسر سید اخلاق حسین

اثر (بھوپال)، پروفیسر عبدالستار دلوی (بمبئی) نے شرکت فرمائی اور اپنے گرانقدر مقالوں سے نوازا۔ حیدرآباد دکن سے پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر فاطمہ پروین، جناب مضطر مجاز، پروفیسر انور معظم، ڈاکٹر یوسف اعظمی، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر مظفر شہ میری اور جناب محمد عبدالرحمٰن نے سمینار میں مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی، جناب میر ایوب علی خان، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر مجید بیدار، ڈاکٹر اختر علی (عثمانیہ) نے مذاکرات کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس موقع پر محمد عبدالرحمٰن صاحب کی مرتبہ کتاب بزبان ''تلگو اقبالیات'' کا رسم اجراء پروفیسر احتشام حسنین وائس چانسلر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے انجام دیا۔ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت کے مقالہ ''مسلمانان ہند کا منفرد تجربہ اور اقبال'' کو بہت پسند کیا گیا اقبالیات کے فروغ اور علاقائی زبانوں میں ترویج وترقی کو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مذکورہ تقاریب کا آنکھوں دیکھا حال ETV اور دیگر T.V Channels سے نشر کیا گیا۔ DVDS اور CDS میں مکمل پروگرام کی عکس بندی بھی کر لی گئی ہے۔ عنقریب اکیڈیمی کی Web-site پر ناظرین مشاہدہ کر سکیں گے۔ یقین ہے کہ علمی حلقوں میں اقبال اکیڈیمی کی ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں جناب ظہیر الدین احمد صاحب صدر اقبال اکیڈیمی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں ڈاکٹر صابر علی سیوانی اور شارپ کمپیوٹر کے جناب مصطفیٰ قاسمی کا بطور خاص شکریہ ادا نہ کروں جن کی لگاتار محنت اور کوشش سے نہایت ہی قلیل مدت میں اس شمارہ کی کتابت وطباعت ممکن ہو سکی۔

آپ کے تعاون اور مفید مشوروں کا شکر گذار

محمد ضیاء الدین نیر

کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی

☆☆☆

ڈاکٹر صابر علی سیوانی

جشن اقبالؔ ایک نظر میں

رپورتاژ

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری نے پوری دنیائے انسانیت کو متاثر کیا ہے۔ اقبال کی پوری زندگی اسلامی اصولوں اور اخلاقی اقدار کے فروغ میں گزری۔ انھوں نے اپنی شاعری سے پوری دنیا کو انسانیت اخوت اور رواداری کا پیغام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی شاعری کی معنویت اسی طرح برقرار ہے۔ جس طرح ان کی زندگی میں تھی۔ ان کے پرستاروں کی کثیر تعداد ہندو بیرون ہند میں پھیلی ہوئی ہے۔ متعدد اداروں اور انجمنوں کے ذریعے اقبال کے پیغام کو وسعت بخشنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور آج بھی ایسے بیشمار ادارے ہیں جو اقبال کے فلسفہ اور ان کے پیام کو پوری دنیا میں مختلف زبانوں کے توسط سے پھیلانے میں پوری ایمانداری سے سرگرم عمل ہیں۔ ہندوستان میں یوں تو اقبال کی شخصیت اور شاعری پر کافی کام ہو چکا ہے اور مختلف پوشیدہ گوشوں کی گرہ کشائی بھی کی گئی ہے۔ آج بھی اقبالیات کے حوالے سے ہندوستان میں کافی تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں قائم اقبال اکیڈیمی اقبالیات کے فروغ میں جس طرح سرگرم عمل ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اقبال اکیڈیمی ایک ایسی اکیڈیمی ہے، جہاں اقبال کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ہزاروں کتابیں موجود ہیں جہاں تشنگان علم وفن اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔ یہ ادارہ جسے نہ سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور نہ ہی کسی طرح سے کوئی مالی تعاون حاصل ہے۔ بس اقبال کے شیدائیوں اور ان کے پرستاروں کے تعاون سے اقبال شناسی کی کوششوں میں یہ ادارہ نہایت متحرک اور فعال ہے۔ اس ادارہ نے اپنے زمانۂ قیام سے نہایت خوش آئند کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جو قابل تحسین وستائش ہیں۔ اقبال اکیڈیمی وقتاً فوقتاً مختلف ادبی تقاریب اور اقبال شناسی کی محفلوں کا انعقاد بھی کرتی رہتی ہے۔ مختلف ثقافتی سرگرمیاں

بھی اس ادارے کے زیرنگرانی عمل میں لائی جاتی ہیں جو اپنی انفرادیت اور خوش سلیقگی کے باعث عوام وخواص میں پذیرائی کا باعث تصور کی جاتی ہیں۔ حال ہی میں علامہ اقبال کے فکر وفن کو سمجھنے کے لئے اقبال اکیڈیمی نے تین روزہ جشن اقبال کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر اقبال اور ہندوستان کے عنوان پر دوروزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد عمل میں لایا گیا، جو نہایت کامیاب رہا اور جسے اہل علم وادب نے کافی سراہا۔

علامہ اقبال کی حیدرآباد آمد کے جشن صد سالہ کے موقع پر اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد کے زیر اہتمام تین روزہ تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ جشن اقبال کا اہتمام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سالار جنگ میوزیم حیدرآباد اور یونیورسٹی آف حیدرآباد کے اشتراک سے عمل میں لایا گیا۔ جشن اقبال کی تقاریب 22,21 اور 23 دسمبر 2010 کو حیدرآباد کے دو اہم مقامات پر منعقد کی گئیں۔ 21 دسمبر کو جشن اقبال تقاریب کا افتتاحی اجلاس میر تراب علی بھون ،سالار جنگ میوزیم میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کے موقع پر شام کو ثقافتی پروگرام اور تقسیم انعامات، میر تراب علی، بھون میں عمل میں آیا۔ 22 اور 23 دسمبر کو دوروزہ سمینار سی پی ڈی یو ایم ٹی آڈیٹوریم مولانا آزاد نیشنل لائبریری حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ جس میں مختلف موضوعات پر اقبال شناسی کے حوالے سے مقالے پڑھے گئے جو اس کتاب میں شامل اشاعت ہیں۔ پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کا بھی بھر پور تعاون حاصل رہا۔ جشن اقبال میں روزنامہ سیاست، منصف، رہنمائے دکن، اعتماد حیدرآباد کے علاوہ ای ٹی وی اردو، حیدرآباد کا بھی بھر پور اشتراک شامل رہا۔ علاوہ انگریزی اخبارات نے بھی ان تقاریب کی تفصیلات نہایت اہتمام کے ساتھ پیش کیں۔

جشن اقبال کے افتتاحی تقریب میں ملک کے مایۂ ناز ادباء شعراء اور سیاسی رہنماؤں کے علاوہ مختلف دانشگاہوں کے سربراہان اور پروفیسر بھی موجود تھے۔ نائب صدر نشین راجیہ سبھا جناب کے آر رحمٰن صاحب نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی پر مغز تقریر میں کہا کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال کو بیسویں صدی کا امام قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کے کلام میں ہندوستان کی آزادی کی تڑپ از ابتدا تا انتہا پائی جاتی ہے۔ اقبال کے ترانہ

ہندی کوانہوں نے جذبۂ حب الوطنی کی بہترین مثال قرار دیا۔صدر اقبال اکیڈیمی کیرالا اور سابق رکن پارلیمنٹ جناب عبد الصمد صمدانی نے کہا کہ جس دور میں اقبال کا نام لینا بھی جرم تھا اقبال اکیڈیمی کو حیدرآباد میں قائم کرنا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔انہوں نے کہا کہ موجودہ معاشرے میں جود ہریت پائی جاتی ہے، یہ دہریت اقبال کے زمانے میں بھی اسی طرح موجود تھی، اور اقبال نے اس دہریت کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی۔ڈاکٹر ظفر محمود صدر اقبال اکیڈیمی نئی دہلی نے اس موقع پر اقبال کے مختلف اشعار کے ذریعے عالم انسانیت کے لئے اقبال کے کلام اور ان کے پیام کی معنویت کو اجاگر کیا۔ڈاکٹر جعفر حسین قریشی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اقبال اکیڈیمی برطانیہ نے نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات کہی کہ نئی نسل اردو سے ناواقف ہوتی جارہی ہے جب کہ اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لئے اردو سے واقفیت ضروری ہے۔

جناب ضیاءالدین نیر جو اس جشن کے روحِ رواں تھے بلکہ یہ انہیں کی کوششیں تھیں کہ جشن اقبال نہایت کامیاب رہا۔ضیاءالدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں جشن اقبال کی غرض وغایت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔انہوں نے اپنی تقریر میں بانی اقبال اکیڈیمی سید خلیل اللہ حسینی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ شکستہ دل مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے انہوں نے اقبال اکیڈیمی کی بنیاد رکھی۔ جو ان کا ایک ناقابل فراموش عمل ہے۔اس موقع پر رکن پارلیمنٹ سید عزیز پاشاہ، ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم ڈاکٹر ناگیندر ریڈی اور ذاکر حسین رکن بورڈ آف ڈائرکٹرس بھی موجود تھے۔سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے کلام اقبال پیش کیا اور نظامت کے فرائض بھی انجام دیئے۔محمد شجاع الدین کی قرأت کلام پاک سے جشن اقبال کے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا۔اقراء مشن اسکول کی طالبات نے اقبال کی نظم ''ترانۂ ہندی'' پیش کی۔،عشائیہ کے بعد موسیقی کا پروگرام منعقد ہوا۔ اس موقع پر عادل حسینی، جسبیر کور، عبد المغنی اور ان کے ہمنواؤں نے کلام اقبال پیش کیا۔ڈائرکٹر میسکو ڈاکٹر افتخار الدین نے شکریہ کا فریضہ انجام دیا۔، جناب انعام الرحمٰن غیور نے موسیقی کے اس پروگرام کی نظامت انجام دی۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں علامہ اقبال کا ذکر کرنا، ایک ناقابل معافی جرم تصور کیا

جانے لگا تھا جس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اقبال نے پاکستان کے قیام کا اشارہ دیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ 1930ء میں الہ آباد کے اپنے تاریخی خطبہ میں علامہ اقبال نے وحدتِ ہند کا نعرہ بلند کرتے ہوئے تمام ہندوستانیوں کو واضح پیغام سنا دیا تھا ونیز 1938ء میں اقبال کے انتقال کر جانے کے دوسال بعد 1940 میں نظریہ پاکستان پیش کیا گیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ علامہ اقبال کا قیام پاکستان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اقبال کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی کا بین ثبوت ملتا ہے۔ تاہم اقبال نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلمان کے لئے وطن محبوب ہے لیکن معبود نہیں۔ اقبال نے یہ بھی بتایا تھا کہ معاشرے میں اعلیٰ وادنیٰ کے فرق کو ختم کئے بغیر وطن کی آزادی بے معنیٰ ہے۔ برطانوی سامراج نے Devide and Rule کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے یہاں کی مسلم وہندو عوام کے درمیان صدیوں سے موجود محبت وایثار میں دراڑیں پیدا کیں اور ہندوستان سے واپس جاتے جاتے انگریزوں نے علامہ اقبال کو شجر ممنوعہ کی طرح پیش کیا۔ ان خیالات کا اظہار صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت مولانا محمد عبدالرحیم قریشی نے علامہ اقبال کی حیدرآباد آمد کے جشن صد سالہ کے موقع پر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ تقاریب کے دوسرے دن اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، یونیورسٹی آف حیدرآباد اور سالار جنگ میوزیم کے اشتراک سے منائے جارہے اس جشن میں سالار جنگ میوزیم کے نواب میر تراب علی خاں آڈیٹوریم میں اجلاس کی صدارت اس تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر سید احتشام حسنین، وائس چانسلر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے کی۔ بشارت عل انجینئر نے انگریزی میں ایک مقالہ پیش کرتے ہوئے اقبال کی شاعری اور اس کی معنویت پر سیر حاصل بحث کی۔ انہوں نے اقبال کے نظریہ خودی کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اپنی انفرادی خصوصیات کے اظہار کا احساس وجذبہ خودی سے مستعار ہے۔ ڈاکٹر سید احتشام حسنین نے اپنے صدارتی خطاب میں اقبال کی شاعری میں روحانیت وخودی کے معنیٰ ومفہوم اپنے دلنشین انداز میں پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ اقبال نے خودی کو روحانیت سے تعبیر کیا ہے اور اسرار خودی کے تحت نوجوان نسل میں آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر حسنین نے کہا کہ آج ہر کوئی اسی فکر میں گم ہے کہ کسی طرح

ڈھیر ساری دولت حاصل کر لی جائے جہاں حلال وحرام کا تصور ختم ہوجاتا ہے ۔ انہوں نے نوجوان نسل سے مخاطب ہوکر کہا کہ آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ جو ہمارے اندر ختم ہو چکا تھا اب اسے دوبارہ زندہ کرنا ناگزیر ہے۔ترقی وکامرانی کے لئے سچی لگن ومحنت کا حصہ 90 فیصد ہوتا ہے جب کہ قسمت اور موقع 10 فیصد پر مشتمل ہے۔اس موقع پر وجئے واڑہ کے تلگوادیب عبد الرحمٰن خان کی جانب سے اقبال کی شہرہ آفاق نظم شکوہ کے تلگوترجمہ کی رسم اجراء بھی عمل میں لائی گئی۔

22اور 23 دسمبر کوجشن اقبال کے سلسلے میں دو روزہ سمینار کا انعقادمولانا آزادنیشنل یونیورسٹی میں عمل میں آیا۔ ایران سے تشریف لائے مہمان خصوصی علی رضا قضوے (ڈائرکٹر ریسرچ سنٹرنئی دہلی نے اپنے خطاب میں اقبال کی شخصیت اوران کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال، مولانا رومی اور شمس تبریزی تینوں کی شاعری میں اخلاق محمدیؐ کی تعلیم نمایاں دیکھنے کوملتی ہے۔انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ علامہ اقبال نے مولانا رومی کے رومی اسلوب کے پیروی کرتے ہوئے اپنی شاعری کوآفاقیت عطا کی ۔علامہ اقبال، مولانا رومی کو پیر رومی کے نام سے یادکرتے ہیں۔اقبال کی 60 فیصد شاعری فارسی زبان میں ہے۔اقبال کی شاعری ایران میں بہت مقبول ہے۔ایران میں بیدل کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ہندوستان کے فارسی کے عظیم شاعر تھے۔علامہ اقبال نے عشق الٰہی کے فلسفہ کوشمس تبریزی سے اخذ کیااور عشق جدید کے فلسفے کو مولانا رومی سے حاصل کیا۔خودی اور عشق کا فلسفہ مولانا رومی سے علامہ اقبال نے حاصل کیا۔ان خیالات کا اظہار علی رضا قضوے (ایران) ڈائرکٹر ریسرچ سنٹرنئی دہلی نے علامہ اقبال کی حیدرآباد میں آمد کے جشن صد سالہ کے موقع پر اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ تقاریب 21 تا23 دسمبر 2010ء کے دوسرے دن سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔مولانا آزادنیشنل اردو یونیورسٹی، یونیورسٹی آف حیدرآباد، اقبال اکیڈیمی لندن اور سالار جنگ میوزیم کے اشتراک سے اس جشن کا اہتمام کیا گیا۔اس اجلاس کی صدارت پروفیسر بیگ احساس، صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی۔اس موقع پر ڈاکٹر جیہان، (ترکی) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبان کی کوئی اتنی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔جتنی اہمیت اس زبان میں

استعمال کیے جانے والے مفہوم اور تخیل کی ہوتی ہے۔ترکی میں اقبال کے کارنامے ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں ترکی کے رہنماؤں اور ترکی تہذیب کی پذیرائی کی ہے۔اقبال نے اپنی نظم ''بلاد اسلامیہ'' میں استنبول کے شہر قسطنطنیہ کا ذکر کیا ہے۔ جہاں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار ہے اور ہزاروں لوگ روزانہ زیارت کے لیے وہاں آتے ہیں۔عثمانی خلافت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ترکی کے تاریخ پس منظر کے ضمن میں کہی، عثمانیوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا لیکن خون صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہوتی ہے کہہ کر اقبال کی شاعری کی طرف اشارہ کیا انہوں نے کہا کہ اقبال ترک اور عرب تعلقات میں ہم آہنگی کا ذکر بھی اپنی شاعری میں کیا۔ترکی خود بیداری اور خود اعتمادی کی ایک اہم مثال ہے۔انہوں نے کہا کہ ترکی نئے اقدار کی تلاش میں ہے جب کہ دوسرے ممالک اپنے پرانے اقدار کو دہرا رہے ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ایران کے انقلاب اسلامی نے ایک عظیم مثال قائم کی جہاں بغیر خوں ریزی کے امام خمینی کی رہنمائی میں 1979ء میں عظیم انقلاب رونما ہوا۔انہوں نے ترکی مسٹزم کو بہت عمدہ طریقہ سے اپنے کلام میں پیش کیا۔ترکی میں خلافت ختم ہوئی اور مسلم سلطنت کا زوال ہوا۔جس زمانے میں اقبال نے خضر راہ لکھی وہ بہت افسوسناک دور تھا۔اس نظم کو سن کر لوگ رونے لگے۔لوگوں کے دل ٹوٹ چکے تھے کیوں کہ خلافت دم توڑ چکی تھی۔انہوں نے یہ سوال قائم کیا کہ اتنی قربانیوں کے باوجود ترکی اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکا۔ آخر کیوں، پروفیسر منظر حسین (رانچی) نے کہا کہ اقبال ہندوستان کی مختلف شخصیات سے متاثر تھے۔جن میں ٹیپو کی بہادری اور اس کے عظیم ولولے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ہندوستان کی عظیم شخصیات میں علامہ اقبال کو میر سید علی ہمدانی، ملا طاہر غنی کاشمیری ٹیپو سلطان وغیرہ سے خاص عقیدت تھی۔ پیام مشرق میں غنی کاشمیری کے نام سے انہوں نے ایک نظم بھی لکھی۔انہوں نے کہا کہ علامہ اقبال نے یہ پیام دیا کہ دنیا سے دل لگانے میں تباہی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔میر سید علی ہمدانی کو اقبال تاریخ کے عظیم معمار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔خواجہ غریب نوازؒ، محبوب الٰہیؒ وغیرہ سے انہیں گہری عقیدت تھی۔سرسید کی ذات میں اقبال کو مرد مومن کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جس کی عکاسی اقبال کی نظم ''سید کی لوح تربت'' پر میں نظر آتی ہے۔

پروفیسر مظفر شہہ میری، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے ،تمل میں اقبال کے تراجم اور مقبولیت ،عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں اس بات کا ذکر کیا کہ ٹامل ناڈو کے چھوٹی چھوٹی جگہوں پر علامہ اقبال کے تمل تراجم پر کئی کام ہوئے جن کا لوگوں کو علم نہیں ہے۔ انہوں نے سلام اور عبدالکریم کی تمل زبان میں علامہ اقبال کی نظموں کے تراجم کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو شاعری کے تصورات حسن وعشق اور تمل کے حسن وعشق کے تصور میں نمایاں فرق ہے۔ انہوں نے مختلف تمل مترجمین کے حوالے سے اقبال کی نظموں کے تراجم کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر قطب سرشار نے کہا کہ اردو کی اصطلاحات اور خاص طور پر علامہ اقبال کی شاعری میں استعمال کی گئی اصطلاحات کا تلگو زبان میں ترجمہ ناممکن ہے۔ انہوں نے مختلف اصطلاحات مثلاً رنگ وبو، محرم، خودی، شاہین ،اکسیر وغیرہ کا ذکر کیا۔ جن کا تلگو میں کوئی نعم البدل موجود نہیں ہے۔ انہوں نے اس جانب اشارہ کیا کہ تلگو میں اقبال کی نظموں کا بہت مختصر ترجمہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اردو والے تلگو سے کما حقہ واقف نہیں ہیں اور تلگو والے اردو نہیں جانتے۔ جناب محمد عبدالرحمٰن وجئے واڑہ نے تلگو زبان میں اقبال کی نظموں کے غلط تراجم کی طرف نشاندہی کی اور ''خودی'' کی اصطلاح کو روح کے معنیٰ میں استعمال کرنے پر تلگو والوں پر تنقید کی۔ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں انہوں نے پیش کرتے ہوئے تلگو زبان میں علامہ اقبال کی نظموں کے غیر موزوں تراجم کی طرف نشاندہی کی اور ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عطا اللہ سنجری (کالی کٹ) عبدالغفور، کیرالا)، کے پی شمس الدین، (کیرالا)، ڈاکٹر جہاں آراء بیگم (میسور) نے اپنے گراں قدر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر عبدالصمد صمدانی صدر اقبال اکیڈیمی کیرالا نے پہلے اجلاس کی صدارتی تقریر میں کہا کہ جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال فلسفی نہیں تھے بلکہ کبھی کبھی ان کو فلسفے سے دلچسپی دکھائی دیتی تھی۔ انہوں نے لفظ ''حکیم'' اور حکمت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قرآن حکیم میں بار باران الفاظ کا ذکر آیا ہے جس کی انگریزی میں کوئی اصطلاح موجود نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس جمالیاتی نراج کے دور میں علامہ اقبال کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر یوسف اعظمی نے انجام دی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جعفر حسین قریشی نے انجام دی۔ اس موقع پر شہر کی عظیم شخصیات کے علاوہ اقبال اکیڈیمی کے عہدیداران اور ادباء،

شعراء، ریسرچ اسکالرس اور اہل علم کی کثیر تعداد موجود تھی ۔ جناب ضیاء الدین نیر صدر اقبال اکیڈیمی کے شکریہ پر اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔

23 دسمبر کو جشن اقبال سمینار، آخری دو اجلاس منعقد ہوئے ۔مختلف دانشوروں نے نہایت پُرمغز مقالے پڑھے ۔اس موقع پر دہلی، کیرالا، بھوپال، حیدرآباد کے مقالہ نگاروں نے اپنی تحقیقی کاوشیں پیش کیں ۔ دہلی سے تشریف لائے ڈاکٹر اوصاف احمد نے اس اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انسان کا اپنا عمل ہی اس کی تقدیر ہے۔

لذت شوق اور لذت کردار کی شکایت جو اقبال نے اپنے زمانے میں کی تھی وہ آج بھی موجود ہے ۔انہیں ہندوستان اور ہندوستانیوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔ دن وطن عزیز میں اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کیے جارہے ہیں، اس کے سد باب کے لیے اقبال کے کلام کی معنویت دوبالا ہوجاتی ہے ۔اقبال کے کلام میں پیکر تراشی ،خلاّقیت اور ڈکشن وغیرہ یہ بتاتی ہے جب تک اردو باقی رہے گی ۔علامہ اقبال کی مقبولیت باقی رہے گی ۔

اس اجلاس کی صدارت، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) نے کی ۔انہوں نے کہا کہ علامہ اقبال کو داغ کی شاگردی پر ہمیشہ فخر رہا۔علامہ اقبال اپنے کلام کو اصلاح کے لیے داغ کی خدمت میں حیدرآباد بھیجا کرتے تھے ۔ داغ کی اصلاح سے اقبال کی ابتدائی شاعری میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں ۔انہوں نے کہا کہ حیدرآباد میں مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کے یہاں بڑے بڑے علماء، پنڈت مشائخین اور صوفیاء کا ایک بڑا طبقہ ٹھہرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حیدرآباد نے مہاراجہ کرشن پرشاد کو فراموش کردیا۔شاد، دبدبۂ ،آصفی، کی سرپرستی کرتے تھے جس میں علامہ اقبال کا کلام چھپتا تھا یورپ میں رہتے ہوئے بھی اقبال کے خوابوں کی سرزمین حیدرآباد تھی ۔اس موقع پر پروفیسر خالد سعید، شعبہ اردو نے اقبال کی نظم، گورستانِ شاہی کا تنقیدی جائزہ پاور پوائنٹ کے ذریعہ پیش کیا اور اس نظم میں موجود فنی جہتوں اور شعری اوصاف کا تفصیل سے ذکر کیا۔انہوں نے نظم میں موجود پیکر تراشی ،استعارات، کنایات، تلازمے کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا اور ایک خوبصورت تشریحی وتوضیحی تصویر پیش کی ۔انہوں نے کہا کہ اس نظم میں ایک ایک لفظ سے بے پناہ ویرانی اور تاسف کا رنگ ٹپکتا نظر آتا ہے ۔ یہ نظم علامہ اقبال نے قیام حیدرآباد کے موقع پر قلعہ

گولکنڈہ کے مشاہدے کے بعد جو تاثر پیدا ہوا اس کی عکاسی نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے۔
پروفیسر اخلاق حسین (بھوپال) نے ''اقبال اور لمعہ حیدرآبادی کے خطوط کے حوالے سے'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اکثر ناقدین نے لمعہ حیدرآبادی کو اقبال کے ذریعہ لکھے گئے خطوط کی تعداد 29 بتائی ہے۔ جب کہ ان خطوط کی تعداد 28 ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لمعہ حیدرآبادی نے ان خطوط میں تحریف بھی کردی۔ علامہ اقبال کے سر راس مسعود اور شعیب قریشی کے نام دو مکتوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہوں نے اقبال اور بھوپال کے حوالے سے کئی دلچسپ حقائق کا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ لمعہ حیدرآبادی نے کچھ جعلی خطوط اپنے نام لکھ کر کے یہ ظاہر کیا کہ علامہ اقبال نے ان کے نام لکھے ہیں جو درست نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بات کہی کہ اگر ایک بھی خط علامہ اقبال نے لمعہ کو لکھا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہے
پروفیسر فاطمہ پروین سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ''اقبال اور صغریٰ ہمایوں مرزا'' کے حوالے سے کہا کہ جنوری 1938ء میں حیدرآباد میں جب یوم اقبال منایا گیا تو یہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اس جشن کے موقع پر تقریر کی تھیں۔ وہ ایک اچھی شاعرہ تھیں اور اپنا کلام اصلاح کے لیے علامہ اقبال کو بھیجا کرتی تھیں اور علامہ اقبال ان کی شعری صلاحیت کے قائل تھے۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے محب حسین کا رسالہ ''معلم نسواں'' جب بند ہوگیا تو اپنا رسالہ ''النساء'' جاری کیا جو ان کی علمی صلاحیت اور شعری وفکری بصیرت کا غماز تھا۔ انہوں نے مختلف افراد کی مدد سے ''انجمن خواتین دکن'' کی بنیاد بھی ڈالی۔ ڈاکٹر یوسف اعظمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ علامہ اقبال مشرق ومغرب کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اقبال کا تاریخی شعور غیر معمولی تھا۔ اقبال کا پیام، پیام انسانیت ہے۔ آج دنیا امن کے لیے ترس رہی ہے۔ اس امن کا پورا منظر نامہ علامہ اقبال کی شاعری میں موجود ہے۔ اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عرب وعجم وسط ایشیا اور بہت سے یوروپی ممالک کو اپنی فکر اور فلسفہ سے متاثر کیا۔ پروفیسر عبدالستار دہلوی نے اپنے مقالے۔ اقبال اور بمبئی۔ میں اقبال کی بمبئی سے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال 4 ستمبر 1905ء کو بمبئی تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ بمبئی میں خوبصورت بازار، شاندار عمارتیں اور کشادہ سڑکیں قابل دید ہیں۔ جہاں یوروپ اور امریکہ کی ہر چیز ملتی ہے لیکن ایک چیز

جونہیں ملتی وہ ہے فراغت، اقبال نے بمبئی کو باغ لندن کا دروازہ کہا ہے۔انہوں نے اپنے تمام تفصیلات کا اظہار اپنے خط میں کیا ہے۔علامہ اقبال نے بمبئی کے مسلمانوں کی سوجھ بوجھ اور پارسیوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بھی ذکر اپنے خطوط میں کیا ہے۔ضیاءالدین احمد برنی نے مرتبہ کتاب ''خطوط اقبال'' میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عطیہ فیضی کے مکان پر سماع کی محفل میں وہ خود شریک تھے۔اورانھو نے اقبال کی حظِ مزاح کا مشاہدہ کیااور اقبال اور عطیہ فیضی کے درمیان ہوئی گفتگوسنی۔مضطر مجاز نے ''جاوید نامہ'' منظر پس منظر کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اقبال کے جاوید نامہ کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔

انہوں نے کہا کہ دانتے کے عشق مجازی سے اقبال نے عشق حقیقی کا فلسفہ اخذ کیا۔فتوحات مکیہ، معراج کے پس منظر میں لکھی گئی کتاب ہے۔انہوں نے کہا کہ ایک مکمل سفر کی روداد سب سے پہلے ہمیں سفر معراج میں ملتی ہے۔جاوید نامہ بلند روحانی اقدار پر مشتمل ہے۔اس موقع پر پروفیسر مجید بیدار صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد آصف (نئی دہلی)، ڈاکٹر عبدالباری (دہلی)، وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیا۔آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر انور معظم نے کی۔

جشن اقبال کے انعقاد میں جن افراد نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں خصوصاً جناب ضیاءالدین نیر صاحب کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی قابل مبارکباد ہیں جن کی انتھک کوششوں اور بے لوث محنتوں کے باعث یہ جشن نہایت کامیاب رہا، جناب سید ذاکر حسین، جناب میر ایوب علی خان، جناب اعجاز محمد خان، جناب عبداللطیف عاطر، جناب جواد حقانی اور رفقاء کی شبانہ روز محنت اور دلچسپی سے اس جشن کی کامیابی مثالی رہی اور عوام وخواص نے اس سے استفادہ کیا۔اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے حوالے سے یہ جشنِ اقبال تاریخ کے صفحات میں ثبت ہوجائے گا کیوں کہ جن اچھوتے اور اہم موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اس سے قبل ایسے عنوانات پر شاذ ونادر ہی مقالے لکھے اور پڑھے گئے۔اس موقع پر صدر اقبال اکیڈیمی جناب ظہیرالدین صاحب کی صحت کیلئے دعا کی گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر یوسف آعظمی

اکیسویں صدی میں شاعر مشرق کی معنویت

مذہبی حسّیت Religious Sensiblity ادب کو وسیع تر شعور عطا کرتی ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے مغربی انداز کے سیکولر مزاج نے اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ عصر جدید میں اس حقیقت کو فراموش کر دیا گیا کہ کلاسیکی ادب کا بڑا حصہ مذہبی شعور کا اظہار ہے۔ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی تو خالصتاً مذہبی حسیت کا ایک رزمیہ ہے، جس کو دنیائے ادب میں ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ انگریزی ادب کے اہم ڈرامہ نگار شیکسپیر کی تخلیقات میں تاریخی کرداروں کے ساتھ عیسائیت کا شعور بھی شامل ہے۔ مابعد الطبیعاتی اسکول (The Metaphysical School) کے مختلف شعراء نے بھی مذہبی شعور کے ذریعے اظہار کے نئے امکانات پیش کیے۔ بیسویں صدی کی اہم شعری اور تنقیدی آواز ٹی، ایس، ایلیٹ نے ہاپکنس پر تنقید کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے کہ ادب کا ایک اندازِ فکر وہ ہے جو صرف دینیاتی نقطۂ نظر کا ترجمان ہوتا ہے اور اس طرح کا ادب کوئی اعلیٰ ادبی اقدار کی تصویر پیش نہیں کرتا۔ لیکن ادب کا دوسرا نقطۂ نظر مذہبی شعور کو فن کارانہ سطح پر ایک نامیاتی وحدت کا اظہار بناتا ہے۔ ادب کی اعلیٰ خصوصیات کا ترجمان ہو جاتا ہے۔ خود ایلیٹ کی شاعری اس بات کی ترجمان ہے۔ ویسٹ لینڈ (The Waste Land) سے فور کوارٹیٹس (Four Quartets) تک اپنے شعری سفر میں انہوں نے فن کارانہ انداز میں عیسائیت کے شعور کو برتا ہے۔ اس شعری کائنات میں ایک مسلسل تلاش ملتی ہے۔ یہ تلاش تشکیک سے یقین کی طرف ایک سفر ہے۔ شاعر نے اپنی ایک اہم نظم ویسٹ لینڈ میں بے جوڑ پیکروں کے انبار میں عصر حاضر کی تہذیب کو ماضی کے حوالوں سے دیکھا ہے۔ بظاہر اس نظم میں مذہبی شعور کی عکاسی نظر نہیں آتی تاہم ایک بے چین روح کا کرب ضرور ملتا ہے۔ یہی جستجو کا سفر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد واضح صورت میں مختلف نظموں

ایش وینسڈ ے (Ash, Wednesday) راکس (Rocks) اور فورا کوارٹیٹس میں ملے گا۔ فکر اور احساس کا یہ گھل مل جانا مختلف سطحوں پر مختلف انداز سے سامنے آتا ہے۔

اقبال کی شاعری بیسویں صدی کی توانا شعری آواز ہے۔ ان کے کلام میں مختلف دھارے ملتے ہیں جن میں قومی نظموں کا ابتدائی دور بھی ہے اور فطرت کی بے پناہ چاہت کا خوبصورت اظہار بھی، انگریزی ادب کے اثرات اور جرمن ثقافت کی جھلکیاں بھی تاہم شعری سفر کے آغاز میں ایک خوابیدہ مذہبی حسیت کی لہریں شعری شعور کی سطح پر آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ شعروادب میں یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ فن کی سطح پر کس طرح عرفانِ ذات، انسان اور کائنات کے مسائل کو پیش کیا جائے۔ وہ شاعری جس سے جذبہ اور فکر گھل مل نہ سکیں، فنی لوازمات کی تکمیل نہیں کرتی۔ وہ ایک خالص اعلان بن جاتی ہے۔ جدید شاعری میں فن کار کی وابستگی، ترسیل کی ناکامی اور بیانات کے اکہرے پن اور دوسرے پہلوؤں پر مسلسل گفتگو ہوتی رہی ہے لیکن عصر جدید کے نقادوں کے ایک بڑے گروہ کا یہ اصرار کہ شاعری کو صرف علامتوں ہی کے ذریعہ برتا جائے شعر کے مختلف رنگ وروپ سے صرفِ نظر کرنے کے مترادف ہے۔ شاعری میں وہ بیانیہ اظہار بھی اہم ہوتا ہے جو درد کی تہذیب سے وابستہ ہو، اور اس کے اظہار میں شعری لوازم کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو، تخیل کی کارفرمائی ہو، احساس کی شدت اور خلوص سے فن کی ترجمانی ہو۔ اقبال نے شاعری میں نئے نئے محاورے، علائم، پیکر، تلمیحات کے ذریعہ ایک نئی شعری کائنات تخلیق کی ہے۔ یہ شعری کائنات چند دیناتی، اصولوں کا مرقع ہی نہیں ہوتی۔

اقبال کی مسلسل جستجو کا محور جہانِ نو کی تلاش تھی۔ ان کے خیال میں زمانے کے دامن میں تغیر ہی کو ثبات ہے۔ ان کا نقطۂ نظر احیا پرستی کا ترجمان نہیں بلکہ تازہ بستیوں کے آباد کرنے کے احساس سے سرشار ہے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

ماضی کی عظمت سے رشتہ استوار رکھ کر اگلے سفر پر نظر ہے۔ اگرچیکہ وہ کہتے ہیں کہ ان کی تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے تاہم انہوں نے امت مسلمہ کو صدیوں کی نیند سے جگانے

کی کوشش کی ۔ وہ کچھ کامیابی سے بھی ہم کنار ہوئے ۔ ایک طرف انہوں نے استعماریت اور سامراجیت کی خونخواری کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی تو دوسری طرف نیشنلزم کے منفی تصورات پر ضرب لگائی ۔ انہوں نے ساتھ ہی ساتھ اسلامی فکر کے ورثے اور ماڈلس کے لیے نثر اور شعر کے حوالوں سے عقلی بنیادیں فراہم کیں ۔ روایت کی اندھی تقلید نئے افق پر سورج کی تابانی کو دیکھنے سے محروم رہتی ہے لیکن طرزِ کہن سے انحراف، قدامت اور جدیدیت کے درمیان کشمکش کا انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر ہوتا ہے۔

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

انہوں نے قصۂ قدیم وجدید کے فرق پر بھی ایک خاص انداز سے نکتہ چینی کی ۔ اقبال نے مغربیت اور جدیدیت کے درمیان فرق واضح کیا۔ حالانکہ ایک عرصہ تک یہ تصورات الجھن کا شکار رہے ۔ انہوں نے تصورِ خودی کے ذریعہ ایک فعال شخصیت کا خواب دیکھا، برصغیر میں طلسم برہمن دکھایا۔ ملائیت کے خلاف آواز اٹھائی، حکیم الامت نے اسلامی فکر کی نئی تشکیل کو ناگزیر قرار دیا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اقبال کی تخلیقی فکر Cult نہیں بنتی ۔ وہ وسیع تر سطح پر ہر ایک مکتبِ فکر کے لیے سرچشمہ تحریک رہتی ہے۔ اقبال جس جہانِ نو کی تلاش کا خواب دیکھتے ہیں وہاں انسانی آزادی کے پیغام سے عبارت لمحے ملیں گے۔

اقبال کے مختلف شعری مجموعے زندگی کی بے شمار وسعتوں کا احاطہ کرتے ہیں تاہم ان میں ایک خاص مرکزی موضوع کی کارفرمائی نظر آئے گی ۔ اسرارِ خودی میں فرد کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ۔ رموزِ بیخودی، اجتماعی خودی کی آئینہ دار ہے ۔ شجر سے پیوستہ رہ کر امید بہار کا پیغام ہے ۔ ضرب کلیم دور حاضر کی کج رویوں کے خلاف اعلان جنگ ہے، جاوید نامہ، انسانی تاریخ کا ایک روحانی سفر ہے، پیام مشرق، گلشن رازِ جدید اور بال جبریل مختلف زاویوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔

ایک تڑپتا ہوا دل، ایک دانشور شاعر، عصر حاضر کے بحران میں کئی زاویوں سے سرچشمہ تحریک ہے ۔ وہ ایک نئی فکری لہر کے پیغمبر ہیں ۔ وہ نئے سفر نئی منزلوں کی تلاش کا حوصلہ دیتے ہیں ۔ مغرب پر ان کی تنقید کبھی کبھی غیر معروضی نظر آتی ہے۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

شعر کے حوالے سے یہ رویہ جارحانہ محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اقبال کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے چھ دہائیوں کے بعد بھی مغربی دنیا میں خونخواریت ملتی ہے۔ کچھ امید کی کرنیں بھی پھوٹی ہیں۔ علوم تازہ سے سرشار مغرب نے علم وتہذیب کے خزانوں کو مالا مال بھی کیا ہے۔ جہاں ایک طرف مادیت اور صارفیت کا سیلاب آیا۔ وہاں جمہوری قدروں، اور انسانی آزادی کا احترام معتبر ہوا۔ انسان دوستی کے جذبہ کو فروغ ملا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے منفی اثرات کی وجہ سے انسان مشین بن گیا ہے۔ احساس مروت کو آلات نے کچل ڈالا۔ کلیسا سے بڑھ کر بینکوں کی عمارات نے اہمیت اختیار کرلی۔ جمہوریت میں بندوں کی گنتی مقدر بن گئی۔ یہاں انہیں تولا نہیں جاتا۔ اب بھی بہتر جمہوریت کیلئے یہ دنیا منتظر ہے۔ اقبال نے شاعر فردا کی حیثیت سے بے شمار امکانات کی نشاندہی کی۔ یہ امکانات ہمیں نئے سفر کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ شاعر مشرق حقیقی معنیٰ میں دیدۂ بینائے قوم ہیں۔

عصر حاضر سے تہذیب اور ثقافت میں بے شمار بنیادی تبدیلیاں در آئی ہیں۔ خاص طور سے بیسویں صدی نے اپنے دامن میں ہزاروں تبدیلیاں سمیٹ لی ہیں اور ان کا تسلسل اکیسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے عالمی گاؤں کے تصور کو حقیقت کا روپ دیا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان سیاسی اور معاشی سطحوں پر اب بھی بنیادی فرق ملے گا۔ مگر بدلتا ہوا عالمی منظر کہہ رہا ہے۔

فاصلے کچھ گھٹ گئے ہیں اس طرح شہروں کے بیچ
ایک نقطہ بن گیا ہے یہ جہاں آنکھوں کے بیچ

پہلی جنگ آزادی 1857 کے بعد برصغیر میں مسلم فکر کے کئی دھارے ملتے ہیں لیکن جدید عہد کو سب سے پہلے جس ذات نے واضح انداز میں محسوس کیا وہ سرسید کی تھی۔ ان کی دانش مندانہ فکری قیادت اور تعلیمی نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے برصغیر پر غیر معمولی اثرات مرتب کئے۔ انیسویں صدی سے ان اثرات کا فیضان اب بھی جاری ہے۔ سرسید کے بعض مذہبی تصورات اور ان کی تشریحات سے اختلاف ممکن ہے، مگر عصر نو کی تفہیم اور نئے چیالنجس کا سامنا کرنے کے لئے جس

حکمتِ عملی کو انہوں نے مرتب کیا۔ اس سے بہت حد تک گریز کرنا آسان نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس طرح کا عمل فراریت کے مترادف ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اکیسویں صدی کے پس منظر میں دنیا کے وسیع تر علاقہ سے کمیونزم کے دم توڑنے، بیسویں صدی کے اختتام تک کئی نظریوں کی موت، ایشیاء کی نئی بیداری، مسلمانوں کا چار صدیوں بعد بیدار ہونے کی کوشش کرنا، اسلامی جدیدیت Islamic modernism پر اصرار اور ان کی اہمیت سے سرسید کے مغرب کے تعلق سے تصورات کسی حد تک اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ مشرق کی بازیافت نے فکر کی محدودیت اور سطحی نقالی سے نجات دی ہے۔ مشرق اور مغرب صرف جغرافیائی اکائیاں نہیں ہیں۔ یہ تہذیبی شناخت سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ مغرب کا نوآبادیاتی نظام، نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت سے عبارت رہا۔ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری سے نظروں کو خیرہ کرنے کی صلاحیت کم ہو رہی ہے۔ مشرق اب اپنے ماضی کی عظمت میں ہی گم ہونا نہیں چاہتا بلکہ شاندار مستقبل کی پرچھائیاں بھی دیکھنے کا منتظر ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ سیاسی کھلواڑ کے باوجود یہ دنیا عالمی گاؤں میں ڈھل رہی ہے۔

فیض احمد فیض نے ''ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات'' میں لکھتے ہیں کہ ذہنی زندگی میں جو تلاطم اقبال کے افکار سے پیدا ہوا ہے غالباً اس سے پہلے کسی بھی واحد مصنف، واحد ادیب یا واحد مفکر کے حصے میں نہیں آیا۔ اس طرح کا تلاطم کسی نے بھی اقبال کے بعد پیدا نہیں کیا۔ فیض نے سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہا اقبال کی فکر کے مقابلے میں سرسید کی تحریک کا دائرہ کار محدود رہا ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق ہندوستان سے رہا ہے جب کہ اقبال کے افکار کا تعلق بہت وسیع ہے۔ فیض نے کلامِ اقبال کے دوسرے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کئی حقیقتوں کی جانب بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔

''بہت سی باتیں جن میں محض وہم وگمان کے بل پر لوگ سلوگنز Slogans کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے، اقبال نے ان کے سوچنے کا غور کرنے کا، مشاہدہ کرنے کا، مطالعہ کرنے کا، تجزیہ کرنے، استنباط کرنے کا اور اس سارے ذہنی پروسس (Process) سے گزر جانے کا ڈھب سکھایا۔ صرف خواص کو نہیں بلکہ عوام کو بھی۔ اقبال نے لوگوں کے ذہن کو ان اثرات سے

ایک حد تک آزاد کرنے میں امداد دی جو غلامی کے سبب پیدا ہو گئے تھے۔ ان کا آخری دور جوان کی پختگی کا دور وہ ہے جب کہ وہ انسانیت اور جملہ کائنات کے بارے میں اپنے افکار کا اظہار کرتے ہیں۔ آفاقی طریقہ سے سوچنے کا ڈھب اور اس کو سوچنے کی ترغیب۔ ہمارے ہاں اقبال نے پیدا کی۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے شعر یا تو تفریحی چیز سمجھی جاتی تھی یا ایک غنائیہ سی چیز سمجھی جاتی تھی یا زیادہ سے زیادہ محض ایک اصلاحی چیز سمجھی جاتی تھی اور یہ بھی حالی کے بعد۔ شعر میں فکر اور شعر میں حکمت اور شعر میں وہ عظمتیں جن کو ہم شاعروں سے نہیں فلاسفروں سے متعلق کرتے ہیں وہ محض اقبال کی وجہ سے ہمارے یہاں پیدا ہوئی ہیں۔ اقبال کی مثال ہمارے ہاں ایک ندی یا ایک نہر کی سی نہیں ہے جو کہ ایک ہی سمت میں جا رہی ہو بلکہ ان کی مثال تو ایک سمندر کی سی ہے جو چاروں طرف محیط ہے۔ چنانچہ ان کو ہم ایک مکتب فکر نہیں کہہ سکتے ہاں ان کو ہم ایک جامعہ سے یا ایک یونیورسٹی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔

''زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے۔ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے'' (غبار خاطر) مولانا آزاد کا مقصدِ حیات غیر منقسم ہندوستان میں اس عصر کی دوسری بڑی شخصیت اقبال سے مختلف نہ تھا۔ دونوں اسلام کی سربلندی کی تمنا رکھتے تھے اور عالمِ انسانیت کو اپنے فکری سرچشموں سے سیراب کرنا چاہتے تھے۔ تاہم دونوں کے منہاج اور طبیعتوں میں بنیادی فرق تھا۔ تذکرہ میں اس بات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ اقبال کی تحریریں الہلال کی بازگشت ہیں تاہم اس طرح کے بیان کے ذمہ دار آزاد نہ تھے۔ اقبال نے سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اس سلسلہ میں شکایت کی۔ بعد میں مولانا آزاد نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اقبال کی فکر اسلامی کی شروعات الہلال کی مرہون منت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے درمیان خلوص کا ربط ضرور رہا ہے۔ الہلال کے پہلے صفحہ پر اقبال کی شعری تخلیق کی اشاعت شاعرِ مشرق کی عظمت کا اعتراف ہے۔ مولانا آزاد اقبال کو ملک الشعراء کے خطاب دینے کے حامی تھے۔ لیکن ان کے حلقہ بگوش اس بات پر معترض تھے کہ اس سے مسلم لیگ کو سیاسی فائدہ ہوگا۔ اس طرح کے سطحی اعتراض کی وجہ سے یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔

اقبال کے انتقال پر بھی آزاد نے اردو کے عظیم شاعر کی حیثیت سے خراج عقیدت پیش کیا۔

اقبال کے دل میں بھی آرزو تھی کہ آزاد سے ملاقات کا کوئی موقع نہ گنوائیں۔ ایک محفل میں انہوں نے خاص طور سے خواہش کی تھی کہ آزاد کے باز ونشست کا انتظام کیا جائے تا کہ تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ ایک بار کسی مسئلہ کے استفسار کے سلسلے میں انہوں نے ایک خط مولانا آزاد کو لکھا بھی ہے تاہم پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کے بعد کوئی پیش رفت ہو سکی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبال بے شمار علماء کو ملی اسلامی اور ملی مسائل کے لئے خطوط لکھتے رہے تھے۔ لیکن مولانا آزاد سے اپنے ذہن میں اٹھنے والے بے شمار سوالات کے جوابات نہیں مانگے۔

اقبال کے معاصرین میں مولانا ابوالکلام آزاد کی عبقری شخصیت نے بھی تاریخ کے ایک دور میں انقلابی خیالات سے روشناس کروایا۔ الہلال کا صحافت کے میدان میں تاریخ ساز رول رہا ہے۔ اقبال اور آزاد کے تعلق سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے رویوں میں فرق ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اقبال سے اپنے عشق کا غیر معمولی ثبوت دیا ہے کیوں کہ انہوں نے مبالغہ کی حد تک ان کی تسکین کے لئے جذباتی وسائل مہیا کیے جب کہ آزاد نے طنز کے نشتر سے جراحت کا کام کرنے کی کوشش کی اور اپنی جھولی میں تلخیاں بھر لیں۔ عصری ہندوستان میں آزاد کی بھرپور معنویت ہے تاہم وہ دلوں کی دھڑکنوں کا حصہ نہ بن سکے۔ اُنہیں وہ اپنائیت نہ مل سکی۔ جس کے وہ مستحق تھے۔ غیر مسلم حلقوں میں بھی آہستہ آہستہ آزاد کے امیج کو مدھم کیا گیا۔ خاص طور سے India Wins Freedom کے ان تیس صفحات کی اشاعت کے بعد جو تین دہائیوں تک راز کے پردوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب انہیں بند کواڑوں سے نکال کر سورج کی روشنی میں رکھا گیا تو کئی اہم چہرے تاریک نظر آنے لگے۔

بڑی سے بڑی شخصیتیں، سوائے چند الہامی برگزیدہ روحانی شخصیتوں کے ہر عہد کے لئے معنویت نہیں رکھتیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے سفاک جبر کے باوجود، گاندھی کا صنعتی وژن، عصر جدید کے لئے معنویت نہیں رکھتا۔ نہرو کے سوشلزم کے تصورات نے بہت حد تک اپنی معنویت کھودی ہے۔

آج کے بے شمار مسائل پہلی جنگ آزادی (1857) کے آس پاس ابھرے تھے، آج

ان کے جوابات یقیناً مختلف ہو سکتے ہیں کیوں کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ مغرب کے تعلق سے جو سرسید کا مفاہمانہ رویہ تھا آج ہمارے لئے معنویت نہیں رکھتا۔ سرسید نے روشن خیالی کی نرم دھوپ میں جو پودے لگائے تھے وہ برگد بن گئے۔ لیکن اس برگد کی اتفاقی جڑیں کچھ اور کھاد مانگتی ہیں۔ شبلی نے سرسید کے عہد ہی میں ان کی فکر کے جھکاؤ سے اختلاف کیا تھا۔ حال کی نسل نے ایک متوازن مفاہمانہ رویہ اپنایا۔ اکبرالہ آبادی نے خالص مشرقیت میں پناہ ڈھونڈی جس میں مغرب کی نسیم سحر کا گزر ہی ممکن نہیں ہے۔ آج کے عالمی گاؤں کے کلچر میں، اس کی تمام بھیانک کمزوریوں اور استحصال کے باوجود اس کے وسیع اثرات ہیں۔ Xenophobia کی شکار قومیں عالمی ورثہ سے کٹ جاتی ہیں۔

اقبال نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آنے والے ادوار پر بھی غیر معمولی اثرات چھوڑے ہیں۔ شخصیتوں اور اداروں کے دلکش قافلہ میں علی شریعتی بھی ہیں۔ شریعتی نے اقبال سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے شاعر مشرق کو ''علی گونہ'' قرار دیا۔ اقبال کو دنیائے علم وفن کی بے شمار برگزیدہ ہستیوں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے لیکن یہ احساس اور خراج نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل شریعت کی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں فکرِ اقبال کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے حسینیہ درسگاہ میں اقبال کی تعلیمات پر بھی کافی توجہ دی تھی۔ یوں تو ان کی زندگی کی صبح اقبال کی زندگی کے شام کے بعد آئی۔ لیکن وقت کے فصل، حالات کی تیز رفتار ترقی کے پس منظر میں انہوں نے کم عمری میں فکر اور جہد کے زبردست امتزاج کے ساتھ ایرانی قوم کے ذہنوں کو بدلا۔ ان کو نئی فکر دی۔ نئے راستے بنائے۔ خودی کے پیغام کی تجدید کی۔ مشرق کی عظمت کا احساس جگایا۔ استعماریت اور ملوکیت کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ پُر اسرار حالات میں ان کی موت شہادت کا پتہ دیتی ہے۔

علی شریعتی نے اقبال کی طرح ''اہل حرم کے سومنات'' سے مقابلہ کیا۔ حکیم الامت کے خلاف کفر کے فتووں کی فیکٹریاں وجود میں آئیں۔ فتنہ پروروں کا ساتھ جب عوام نے چھوڑ دیا تو وہ پھر کھسیانی بلی کی طرح کھمبے نوچتے رہے۔ شریعتی کو بھی قدامت پسند، پروفیشنل علماء کی خاطر خواہ تائید حاصل نہ ہو سکی۔ شریعی کی تحریریں اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں کہ اقبال 'جمال

الدین افغانی اور محمد عبدہ کی طرح عظیم مفکر تھے جنہوں نے مشرقی دنیا میں عظیم انقلاب پیدا کیا۔ شریعتی کے ہاں بھی تاریخی پس منظر میں ہیومانزم کی بنیادی اہمیت ہے۔ زندہ رود میں جاوید اقبال نے بتایا کہ اقبال مسلک انسانیت کو صرف سیاسی جہت سے متصف کرنے کے خلاف تھے۔ شریعتی پر اقبال کے اثرات کے نتیجے میں اسلام کا ایک آفاقی قوت کی حیثیت سے تصور گہرا ہوا۔ اجتہاد پر بھی انہوں نے زور دیا۔ آج کی تیز رفتار دنیا میں اجتہاد کا عدم استعمال جمود سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ایک جہانِ نو کی تشکیل کے لئے انسان صاحب اختیار ہے۔ شریعتی کہتے ہیں کہ اقبال کی جہاں بینی، علم وفن کے بے شمار سرچشموں سے کشید کرنے کے نتیجے میں ذوقِ آرزو کے بطن میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

جاوید اقبال کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے لبرل ازم پر کئی اثرات میں سرسید کی قدامت پسندی، شبلی کے ریڈیکل ازم، جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم (Pan Islamism) کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے حکیم الامت کی تحریروں کے انداز پر بھی روشنی ڈالی۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال اپنے پیش رؤں کی طرح مناظرانہ انداز کی تحریروں سے گریز کرتے رہے ہیں۔ ان کا طرز عذر خواہانہ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے بہت جرأت کے ساتھ خودی کی تعمیر پر زور دیا جو مسلمانوں کی سماجی زندگی اور سیاسی حیات نو رکھنے کا باعث ہوئی۔ (مئے لالہ فام ص (38,37) جاوید اقبال نے علامہ کی عظمت کا احساس دلانے کے لئے قائداعظم محمد علی جناح کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انہوں نے اپنے لئے مسلم ریاست کی حکمرانی پر کلامِ اقبال کے انتخاب کو ترجیح دی (صدارتی تقریر ۴ مارچ ۱۹۴۰)

ایک تخلیق کار کی تحریروں کو مختلف سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے اس طرح ان کے خطبات، بیانات، مکتوبات اور جدوجہد کی سمتوں کو دیکھنے کے کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے تصور انسان سے مختلف اور متضاد آرا بھی ممکن ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مذہبی، ثقافتی اقدار کی بہتر برقراری کیلئے ایک علاقہ کی تشکیل جس کی نوعیت چاہے کچھ ہو ایک سازگار فضا مہیا کرتی ہے۔

فکرِ اقبال سمندر کی طرح ہے۔ اس کی گہرائی میں علم، تجربوں اور دردمندی کے بے شمار

خزانے ہیں۔ جب بھی ہم اس میں غواصی کرتے ہیں نئے موتی، نئے صدف ہاتھ آتے ہیں۔ یہہ وہ سمندر ہے جس میں صدیوں کے مدوجزر ہیں۔ موجیں ہیں، سیلِ رواں ہے، لہروں کا ارتفاع ہے، ساحلوں کی سمتوں کی نشاندہی ہے۔ سمندر کے ساحل پر لہروں کی تحریروں کی انمٹ نقوش ہیں۔ کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے کہ ایک شخص نے جو اپنی ذات میں انجمن تھا، زندگی اور کائنات کے کتنے رازداں کا ہمیں شریک بنایا ہے۔ فلسفہ کی سطح پر قدروں کی گفتگو ہے، کلام کی وساطت سے جذبوں کی دنیا ہے، مکاتیب اور شذرات کے حوالوں سے جزئیات کے دفتر ہیں۔ اردو، انگریزی، فارسی کے دامن میں جو شعری کائنات روشن ہے وہ نسل در نسل راستوں کا عرفان عطا کرتی ہے۔ اس کی روشنی میں ہر نسل کو اپنے خوابوں کی منزل تلاش کرنے میں دشواری کا احساس نہیں رہتا۔ یہہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر نسل کو اپنی منزل خود تلاش کرنی چاہئے۔

اس تیز رفتار عہد میں تصورات دھوپ چھاؤں کی طرح ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری سانسوں کی ڈور پر کئی نظریوں نے دم توڑ دیا۔ ہر نسل کو اپنے حالات اور شعور کی روشنی میں خوابوں اور آرزوؤں کا ہیولا تیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے Role Models کا بھی تعین کرتی ہے۔ وقت کی دھند میں وہ چہرے کھو جاتے ہیں جن میں رعنائیوں کی تابنا کی برقرار نہیں رہ پاتی۔ دانش وفکر سے نکلی ہوئی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جن کی موجیں دور تک پھیلنے کی طاقت رکھتی ہیں اور ان کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی ہے۔ وقت اس بات کا شاہد ہے کہ بیسویں صدی میں ابھرنے والی اقبال کی توانا شعری آواز اکیسویں صدی میں بھی معنویت رکھتی ہے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد عبدالرحیم قریشی
صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت

مسلمانان ہند کا منفرد تجربہ اور اقبال

(یہ مضمون اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے جشن اقبال کے اجلاس م۲۲/ ڈسمبر ۲۰۱۰ء میں پیش کیا گیا)

علامہ اقبال کا نام لینا ہندوستان میں' آزادی کے بعد جرم سمجھا جاتا تھا اور لوگ بھی اس عظیم پیامی شاعر کا نام لینے اور ان کے بارے میں کچھ کہنے سے جھجکتے تھے۔ اس صورتحال کو بدلنے میں اقبال اکیڈیمی کا اہم رول ہے جس نے علی الاعلان اقبال کے کلام و پیام کو عام کرنا اپنا مقصد قرار دیا اور اس کے لئے بانی کل ہند مجلس تعمیر ملت سید خلیل اللہ حسینیؒ علیہ الرحمہ کی کاوشیں ناقابل فراموش ہیں جنھوں نے اقبال کے پیام کو اپنی تقاریر اور لکچرس میں پیش کیا۔ اور پھر اقبال اکیڈیمی کی بنیاد ڈالی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اقبال کا ذکر کرنے سے کوئی پس پیش نہیں کرتا۔

اقبال سے یہ الرجی اس لئے تھی کہ انھیں پاکستان کا نظریہ ساز اور پاکستان کے تصور کا خالق مان کر' ملک کی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا اور ہر وہ شخص جس نے تقسیم ملک میں اہم حصہ ادا کیا تھا ملک دشمن اور مجرم سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے خطبہ میں غیر منقسم ہندوستان کے مسلم اکثریتی صوبہ جات کے لے انھوں نے خود اختیاری کی بات کہی تھی۔ مگر ۱۹۳۸ء میں ان کے انتقال تک مطالبہ' پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا اور اس نظریہ کی صورت گری نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان کی قرارداد علامہ اقبال کے انتقال کے دو سال بعد مسلم لیگ نے لاہور اجلاس میں منظور کی۔ نظریہ پاکستان کی صورت گری سے پہلے اس سوال پر غور نہیں کیا گیا ہوگا کہ ان مسلمانوں کا کیا ہوگا اور انھیں کس طرح پیدا شدنی صورت حال سے مقابلہ کرنا چاہیے جو اقلیت کی حیثیت میں دوسرے صوبوں میں رہ جائیں گے۔ پاکستان کے نظریہ کی تشکیل کے بعد یہ سوال ضرور ذہنوں میں اٹھا ہوگا کیونکہ جو لوگ آبادیوں کے منتقل ہونے کی سوچتے تھے وہ بھی سمجھتے تھے کہ سارے مسلمانوں کا پاکستان منتقل ہونا اور سارے ہندوؤں کا

ہندوستان منتقل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ جن اصحاب نے بھی اس پر غور کیا ان کے پاس یہی حل تھا کہ مسلمان باقی ہندوستان میں محکوم بن کر رہیں گے اور اسی حیثیت میں وہ رہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات ان کے ذہن میں آتی تھی کہ پاکستان میں ہندوؤں کی حیثیت یرغمال کی ہوگی اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں سے بہتر سلوک کی ضمانت ملے گی لیکن وہ ہر حیثیت میں محکوم رہیں گے۔ مسلمان یا تو حاکم رہے ہیں یا محکوم۔ کوئی تیسری حیثیت پیش نظر نہیں تھی۔ اقبال کے کلام اشعار اور نثر میں بھی یہ دو حیثیتیں ہی نظر آتی ہیں۔

دستور کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں دستوری اعتبار سے، کوئی مذہبی طبقہ نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ سب شریک اقتدار اور شریک حکومت ہیں۔ مسلمان محکوم نہیں بلکہ شریک اقتدار اور حکومت سازی میں شریک کار ہیں یہ مسلمانوں کے لئے ایک نیا تجربہ ہے جس کا آغاز ہندوستان میں ۱۹۵۰ء میں دستور کے نفاذ سے ہوا۔ ابھی تک مسلمان اپنی اس دستوری حیثیت کو عملی حیثیت میں بدلنے نہیں پائے ہیں اور ملک کے ارباب بست وکشاد نے بھی اس کی عملی صورت گری کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ اقبال کے پاس اس نئے تجربہ میں کیا لائحہ عمل ہے؟ اس کا جواب نہیں ملے گا کیونکہ ان کی حیات میں ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی تھی اور تاریخ میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں تھی۔ اس نئے تجربہ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو حکمت اور جرأت کے ساتھ آگے بڑھنا اور سرگرم عمل ہونا ہوگا۔ اقبال کی یہ پیش بینی قابل غور ہے کہ سارا دارومدار ماضی کے تجربات پر نہ ہو، بغداد و کوفہ کو ذہن میں لانے اور پیش نظر رکھنے کی بجائے نئے راستے، نئے حل اور نئی منزل کا تعین کرنا ہوگا ع کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد۔

مثل مشہور ہے اور بڑی حد تک حقیقت بھی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جہاں تک مسلمانانِ ہند کے منفرد موقف اور تجربہ کا تعلق ہے ماضی میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلمؐ کے دور حیات میں صحابہ کرامؓ کی ایک تعداد کے ملک حبشہ میں قیام کو ستائے گئے شہریوں کی پناہ گیری قرار دیا جاسکتا ہے۔ دور رسالتؐ کے بعد کی تاریخ اپنے آپ کو ان کے معاملے میں پورے طور پر نہیں دہرائے گی۔ تاریخ میں ایسی مثالیں ہیں کہ چند مسلمانوں کے حسن

عمل اور کوشش و کاوش کے نتیجہ میں سارا قبیلہ یا سارا علاقہ اسلام کے دامن میں آ گیا۔ تاریخ اپنے اس پہلو کو دہرا سکتی ہے مگر اس سمت میں مسلمانان ہند کی حکمت عملی اور کوششیں مفقود ہیں۔ اقتدار سازی میں شراکت کا منفرد تجربہ ہے جس میں کامیابی کے ذریعہ مسلمان نئی تاریخ بنائیں گے کیونکہ اس تعلق سے تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

تو اپنی سرنوشت آپ اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

ہندوستانی مسلمانوں کے نئے اور منفرد تجربہ کے دوران دستوری حیثیت اور عملی صورت حال میں بین فرق اور کھلے تضاد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل کے تعلق سے اقبال سے رہنمائی ملتی ہے۔ اقبال نے وطنیت یا قوم پرستی یا نیشنلزم پر سخت تنقید کی ہے۔

وطنیت یا قوم پرستی کی مخالفت یا اس کو رد کرنے کا مطلب وطن دشمنی نہیں۔ وطن یا جس جگہ بھی مسلمان رہتا ہو اس کو دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی پر وین سلام ابھارتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ماحول کے لئے مفید، وطن دوست اور محبِ وطن ہوتا ہے مگر وہ وطن کی پرستش نہیں کر سکتا۔ اسی کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے کہ سیاست کے میدان میں وطن کچھ اور نوعیت رکھتا ہے جو اسلام میں وطن کے تصور سے مختلف ہے وطن پرستی کے تعلق سے اقبال نے بہت شعر کہے ہیں اور نثر میں بھی لکھا ہے۔ یہ شعر ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے کافی ہے کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

ہندوتوا کا نظریہ رکھنے والی جماعتیں دراصل اسی وطن پرستی کی دعوت دے رہی ہیں اور اس کو قبول کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے مسلمانوں پر دباؤ بنا رہی ہیں۔ مگر اب تک انھیں کوئی کامیابی نہیں مل سکی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال نے وطن پرستی کے خلاف جو فضا بنائی تھی اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ اقبال کی زندگی ہی میں 'وندے ماترم' کو قومی

ترانہ بنانے کی بات چھڑی تھی۔ اقبالؔ نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس کو مشرکانہ قرار دیا تھا اور آج بھی مسلمانان ہند کی بھاری اکثریت اس ترانہ کو مشرکانہ جانتی اور اس کے خلاف ہے کہ وطن مسلمانوں کو محبوب ہے لیکن ان کا معبود نہیں ہے۔ مسلمانوں نے جہاں اسلام کے پیام توحید کو برادران وطن تک پہنچانے کی کوئی منظم کوشش نہیں کی اسی طرح اسلامی مساوات کو نہ پیش کیا اور نہ اس کا عملی مظاہرہ کیا۔ دستور میں مساوات کو بنیادی حق قرار دینے کے باوجود چھوت چھات کے خلاف قوانین بنانے کے باوجود برادران وطن میں آج بھی ذات کی بنیاد پر ادنی اور اعلی کا تصور باقی اور قائم ہے بلکہ اس پر عمل بھی ہوتا ہے۔ مسلمان مساواتِ انسانی کے نقیب بننے کی بجائے خود پیدائش کی بنیاد پر اونچ نیچ کے غیر اسلامی رویہ کو اپنا کر برادریوں میں منقسم ہیں' اسی کی تعبیر اقبال نے یوں کی ہے کہ 'مرغ حرم' کے بال و پر آلودہ پراگندہ ہو چکے ہیں اسی لئے وہ آواز لگاتے ہیں۔

تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اقبال کے نزدیک معاشرہ میں ادنی و اعلی کے امتیاز کو مٹائے بغیر آزادی بے معنی ہے۔ اونچ نیچ کے فرق میں ڈوبے ہوئے معاشرہ کی سیاسی آزادی' حقیقت میں آزادی نہیں ہے صرف آقاؤں کی تبدیلی ہے۔

غلامی ہے اسیر امتیاز ماوتو رہنا

اپنے وطن اور اپنے وطنی معاشرہ کے لئے مسلمانوں کو مفید اور کارآمد بن کر حالات کو یکسر بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف وہ اپنے ملی معاشرہ میں ادنی و اعلی کے امتیاز کو ختم کریں اور دوسری طرف ملک میں مساوات انسانی کے نقیب بن کر ابھریں۔ نیچ سمجھے جانے والے عوام کو مساوات کی لذت سے آشنا کرائیں اور ان سے ہمدردی کرنے کے ساتھ برتری اور تفوق کا احساس رکھنے والوں کی طرف سے ان پر ظلم و ستم کے موقعوں پر ان کی ڈھال اور ان کا سہارا بن جائیں تب ہی ہندوستان اس غلامی سے آزاد ہوگا جو امتیاز ماوتو کی وجہ سے موجود ہے۔

ہندوستان کا اکثریتی سماج برہمنی مزاج کا مظاہرہ ماضی میں کر چکا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ یہ انضمامی و انجذابی مزاج ہے۔ تاریخ میں کئی واقعات اس کا ثبوت ہیں۔ اس ملک میں آریایوں کے بعد کئی نسلوں کے لوگ آئے' ساکا آئے' سائی تھین آئے لیکن آج ہندوستان میں

ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جوان نسلوں سے خودکو وابستہ کرے اور سا کا یا سائی تھین ہونے پر فخر کرے۔ کہاں گئے یہ سب' کہاں گئے کنشک کے لوگ جس کی حکومت میں شمالی ہندوستان کا بڑا حصہ شامل تھا کیا ان کو آسمان نے اوپر اٹھا لیا یا زمین ان کو نگل گئی یا کسی آگ میں یہ بھسم ہو گئے یا سیلاب ان کو بہا لے گیا؟ نہیں' بالکل نہیں۔ اکثریتی سماج کے انضمامی مزاج نے ان کو اپنے میں ضم و جذب کر کے ذات پات کے برہمنی نظام کا حصہ بنا دیا اور ان کی انفرادیت اور شناخت ختم ہو گئی۔ مہاتما گوتم بدھ اور تیرتھنکر مہاویر کی بودھ اور جین تحریکات دراصل برہمنی مزاج اور اونچ نیچ کے برہمنی سماج کے خلاف احتجاجی تحریکات تھیں مگر گوتم بدھ اور مہاویر کے مجسموں کو اپنے عبادت خانوں میں سجا کر اور اپنا معبود قرار دے کر ان کو ضم اور جذب کر لیا۔ اب یہی تجربہ مسلمانان ہند پر دہرانے کی کوشش چل رہی ہے۔ مسلمان سابق میں لوہے کے چنے بنے رہے جنھیں چبایا نہیں جا سکا اور آج بھی اسی قوت کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم کو اقبال کے نظریہ خودی سے روشنی ملتی ہے۔ خودی کے معنی 'فخر و گھمنڈ نہیں بلکہ اپنی انفرادیت اور اپنے امتیازات و خصوصیات پر اصرار اور ان کا استحکام ہے۔ خودی اپنے منفرد وجود کو منوانے اور اس کی بحال و برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے سے عبارت ہے اور اقبال کے نزدیک کسی انسانی گروہ کی خودی کی موت' اس کے وجود کا خاتمہ اور اس کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ہے۔ خودی کے استحکام میں یعنی اسلامی خصوصیات اور امتیازات سے ہر صورت اور ہر قیمت وابستہ رہنے ہی میں ہماری اس ملک میں بقا ہے اور اسی پر ہمارے مستقبل کا دارومدار ہے۔

خودی اور انفرادیت کے استحکام کے سلسلہ میں اقبال شریعت کی برقراری اور اس کی پابندی پر بھی زور دیتے ہیں جہاں وہ اجتہاد کے زبردست حامی ہیں اور اس کو ہر مسلمان کا حق قرار دیتے ہیں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہبی گروہوں کی خودی کا استحکام اور ان کی انفرادیت کا اثبات اس پر بھی مدار رکھتا ہے کہ وہ مذہب پر مبنی قوانین بالخصوص عائلی قوانین کی پابندی کریں انھوں نے مسلمانوں اور ان کے بعد انگریزوں کی حکومتوں کے تحت رہنے کے باوجود ہندو سماج کی برقراری و بقا کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ اس سارے عرصہ میں منوسمرتی یعنی منو کے شاستر پر عمل پیرا رہے۔ یہی بات انھوں نے یہودیوں کے بارے میں کہی ہے کہ وہ جہاں بھی رہے اپنے

خاص تالمودی قوانین پر عمل پیرار ہے جس کے باعث ان کی انفرادیت قائم رہی' اقلیت میں رہنے کے باوجود ان کو اکثریت جذب نہ کرسکی۔ اقبال کا یہ نظریہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے ان کے لئے قابل غور ہے جو جیسا ملک ویسا قانون کا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔

انضمانی ذہن ومزاج یہ بھی چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کردیں یا کم ازکم ہندوستان میں اپنی تاریخ کے تعلق سے نادم اور شرمسار رہیں اور اس ندامت شرمساری کے نتیجہ میں اپنی تاریخ کو فراموش کرنے لگیں۔ یاد رکھیے کہ اقبال نے تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے اور قوموں کا حافظہ قرار دیا ہے۔ اقبال کا نقطہ' نظریہ ہے کہ جس طرح حافظہ کسی فرد کی انفرادیت کے لئے ضروری ہے اسی طرح کسی قوم کے لئے اپنی تاریخ کا ادراک وفہم ضروری ہے تاریخ اقوام کے لئے حافظہ کا کام کرتی ہے اور ان کی انفرادیت اور خودی کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار پر ابھارتی ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کی تاریخ کو ہندوستان کے جغرافیائی حدود میں دیکھیں تب بھی ہماری تاریخ میں کوئی ایسا عمل اور واقعہ نہیں ملے گا جو ہمارے اندر اپنی ہی تاریخ سے نفرت کا جذبہ اور ندامت کا احساس پیدا کرے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی سامراجی گرفت میں لینے کے لئے مسلم حکمرانوں کی تصویر کو مسخ کرکے اس طرح پیش کیا کہ ہندوؤں میں ان سے نفرت پیدا ہو اور وہ انگریزوں کو اپنا محسن اور مسلمانوں کے ظلم سے نجات دلانے والے سمجھ کر انگریزی سامراج کا ساتھ دیں۔ دو مثالیں انگریزوں کی اس شرانگیزی کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دہلی کی مغل حکومت سے نفرت پیدا کرنے کے لئے انگریزوں نے اورنگ زیب کا انتخاب کیا کیونکہ ان کی حکومت سارے ہندوستان پر محیط تھی۔ ایسی تاریخیں لکھیں لکھوائیں جن میں اورنگ زیب کو مندروں کا توڑنے والا اور ہندوؤں کا دشمن بنا کر پیش کیا گیا۔ مندروں کو توڑنے کے الزام کا ثبوت گھٹتے گھٹتے بنارس کے کاشی وشوانا تھ مندر پر ٹک جاتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس مندر میں ایک ہندو رانی کی عفت کو تار تار کیا گیا تھا جس پر ہندو راجاؤں نے جو اورنگ زیب کے لشکر میں شامل تھے اس مندر کے انہدام کی اجازت چاہی تھی کہ جس مندر میں عورت کی عزت لوٹی جائے وہاں بھگوان نہیں رہتے۔ اگر اورنگ زیب ہندوؤں اور مندروں کا دشمن ہوتا تو مندروں کے اخراجات کے لئے بطور انعام زمینات کیوں دیتا! بنارس کے جنگم باڑی مندر میں اورنگ زیب کے انعام کی دستاویزات موجود ہیں۔ ایسی سینکڑوں دستاویزات مل سکتی

تھیں لیکن انگریزوں نے ہوشیاری یہ کی کہ زمین کے عطیات یا نقد انعامات کو جاری رکھنے کے لئے شرط یہ لگائی کہ مغل دور کی سندات انگریز حکومت کے حوالے کر دیے جائیں اس طرح انھوں نے ثبوت مٹانے کی کوشش کی ۔ دوسری مثال ٹیپو سلطان کی ہے اس حقیقت کا خود انگریز مصنفین کو اعتراف ہے کہ جب شہادت کے بعد پورے سرکاری اعزازت کے ساتھ ٹیپو سلطان کا جنازہ سری رنگا پٹنم کے قلعہ سے باہر لایا گیا تو جنازہ کے آگے ہندو عورتیں اشنان کر کے بھیگے بالوں کے ساتھ آ کر رونے اور پیٹنے لگیں ۔ یہ سلطان ٹیپو شہید کی ہندو عوام میں مقبولیت کا ثبوت تھا۔ یہ سوال بھی عوامی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کیوں ٹیپو سلطان شہید کا جنازہ جس کو وہ اپنا سب سے بڑا دشمن اور ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے انگریزوں نے سارے سرکاری رسومات اور انگریزی فوج کی سلامی کے ساتھ نکالا اور کیوں لاش کو قلعہ کی دیور سے نہیں لٹکا دیا؟ ہندو توا عناصر انگریزوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ۔ انگریزوں کی گھڑی ہوئی جھوٹی تاریخ کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ وہ بھی جھوٹی تاریخ لکھوا کر اس کو فروغ دے رہے ہیں تا کہ مسلمانوں میں ان کی اپنی تاریخ سے نفرت اور اس پر ندامت کا جذبہ پیدا کیا جائے ۔ بابری مسجد کو رام جنم بھومی قرار دینے کی شر انگیز سازش کے پیچھے بھی یہ جذبہ کار فرما ہے اس سازش کے مقابلہ کے لئے اقبالؔ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو حوصلہ ملتا ہے جس نے کسی قوم کے وجود کے لئے تاریخ سے اس کی وابستگی کو حافظہ قرار دے کر اس کی حفاظت اور اس کے صحیح ادراک کو ضروری قرار دیا۔

اقبال کی معنویت Relevance پر بہت کچھ کہا گیا اور لکھا گیا' کہا جائے گا اور لکھا جائے گا میں نے مختصر انداز میں معنویت کے چند اہم پہلوؤں پر گفتگو کی ہے جس کو بعض اصحاب سیاسی تجزیہ قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھ چرانا بڑے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے میں نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا انداز علمی Academic نہیں ہے مگر ان حقیقتوں سے ہندوستان میں مفر بھی نہیں ہے میں اپنی اس گفتگو کو اقبالؔ کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

☆☆☆

جناب رحمن خان صاحب ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا، جشن اقبال حیدرآباد دکن کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے (دائیں سے بائیں) سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی، جناب محمد ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی، ڈاکٹر ظفر محمود (دہلی)، جناب ڈاکٹر حسین ترمذی سالار جنگ میوزیم، جناب عزیز پاشاہ (یم پی) ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن) ڈاکٹر افتخار الدین (میسلو) ڈاکٹر عبدالصمد صمدانی (یم پی) کیرالہ

مؤنیر کارسم اجراء، جناب رحمن خان صاحب ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا انجام دیتے ہوئے (دائیں سے بائیں) جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی، جناب عزیز پاشاہ یم پی، جناب محمد ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی، جناب رحمان خان صاحب، ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن)، ڈاکٹر محمد افتخار الدین (میسلو)، ڈاکٹر عبدالصمد صمدانی یم پی (کیرالہ)۔

پروفیسر شیونے کمار (جنہیں علامہ اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل ہے) افتتاحی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے

جناب رحمن خان صاحب ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا سالار جنگ میوزیم میں ''نمائش اقبالیات'' کا مشاہدہ کرتے ہوئے۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر کارگذار صدر اقبال اکیڈیمی، جناب احمد علی صاحب (سالار جنگ میوزیم) بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین وائس چانسلر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی جشن اقبال'' کے موقع پر منعقدہ جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے ۔ جناب عبدالرحمن (وجئے واڑہ)، جناب محمد ضیاء الدین نیر، جناب عبدالصمد صمدانی (ایم پی)، جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، جناب بشارت علی انجینئر ،

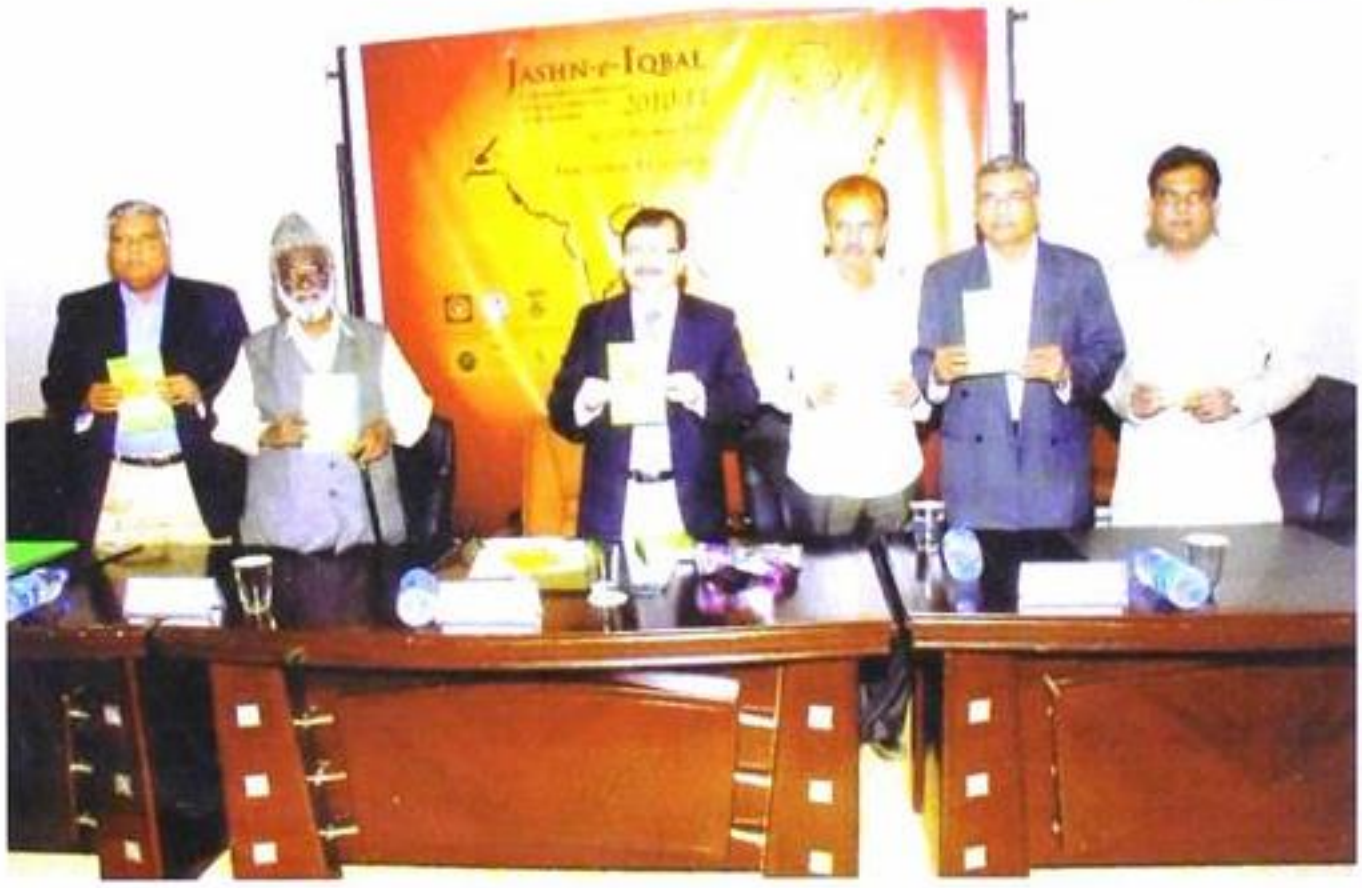

تلگو میں اقبالیات پر جناب عبدالرحمن (وجئے واڑہ) کی تصنیف کا پروفیسر احتشام حسین وائس چانسلر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے رسم اجراء انجام دیا۔ (دائیں سے بائیں) جناب ذاکر حسین، جناب محمد ضیاء الدین نیر، جناب عبدالرحمن، پروفیسر احتشام حسنین، جناب محمد عبدالرحیم قریشی صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت، جناب بشارت علی۔

سید امتیاز الدین، محمد ضیاء الدین نیر، ڈاکٹر حسین، عزیز پاشاہ (ایم پی)، رحمن خان صاحب (ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا) ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن)، جناب ڈاکٹر افتخار الدین (میسکو)

جناب نذیر الدین احمد (مصنف حیات بہادر یار جنگ) ڈاکٹر عبد الصمد صمدانی (ایم پی کیرالہ) کو اپنی تصانیف کا تحفہ پیش کرتے ہوئے، جناب ضیاء الدین نیر، جناب یوسف اعظمی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

سیمینار کو مخاطب کرتے ہوئے جناب محمد ضیاء الدین نیر (دائیں سے بائیں) پروفیسر مظفر شہ میری، جناب عبد الغفور (کیرالہ) جناب کے پی شمس الدین (کیرالہ)، ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن)، جناب قطب سرشار، پروفیسر نسیم الدین فریس۔

پروفیسر مظفر شہہ میری ٹامل میں ''اقبال کے ترجمے اور ان کی مقبولیت'' مقالہ پیش کرتے ہوئے جناب عبدالغفور (کیرالہ)، جناب پی کے شمس الدین (کیرالہ)، ڈاکٹر جعفر حسین قریشی (لندن) صدر اجلاس، جناب قطب سرشار اور پروفیسر نسیم الدین فریس (ناظم اجلاس)

پروفیسر ضیاء الدین احمد شکیب (لندن)، ڈاکٹر عبدالصمد صمدانی (ایم۔پی) کیرالہ کو مومنٹو پیش کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر علی رضا قضوے (ایران) ''فکر اقبال'' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے۔ پروفیسر جہاں اوزڈنر Prof. Gilan Ozdenir (ترکی) پروفیسر بیگ احساس (صدر اجلاس)، پروفیسر جہاں آرا بیگم (میسور) اور ڈاکٹر اختر علی (ناظم اجلاس)

محترمہ جسبیر کوراوران کے ہم نوا ساز پر کلام اقبال پیش کرتے ہوئے۔ سالار جنگ میوزیم آڈیٹوریم میں

محمد عبدالمغنی اوران کے ہم نوا ساز پر کلام اقبال پیش کرتے ہوئے۔ سالار جنگ میوزیم آڈیٹوریم میں

وارثی برادرس اوران کے ہم نوا ساز پر کلام اقبال پیش کرتے ہوئے۔ سالار جنگ میوزیم آڈیٹوریم میں

سید عادل حسینی اوران کے ہم نوا ساز پر کلام اقبال پیش کرتے ہوئے۔ سالار جنگ میوزیم آڈیٹوریم میں

پروفیسر مظفر شہ میری
حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

تمل میں اقبال کے ترجمے اور اُن کی مقبولیت

تمل ناڈو میں اردو تراجم سے کافی پہلے فارسی اور عربی تراجم کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہاں فارسی ترجمے کا اولین نقش چار سو سال پہلے مثنوی مولانا روم کے ترجمے کی صورت میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تین کاسی کے ایک صوفی، بزرگ پیر محمد نے (جن کی درگاہ کیرالا میں بہ مقام تکال آج بھی زائرین وعقیدت مندوں کی مرکز بنی ہوئی ہے) اپنی معروف نظم، بسمل پرم، مثنوی مولانا روم سے متاثر ہوکر لکھی تھی۔ چوں کہ وہ فارسی سے ناواقف تھے اس لیے ان کے ایک مصاحب مولوی صادق اللہ عالم نے اُن کے ذوقِ مطالعہ کے لیے مثنوی کا ترجمہ تمل زبان میں کیا تھا۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا ص ۱۶۲) چنانچہ تا حال اس ترجمے کو تمل میں فارسی کے اولین ترجمے کی حیثیت حاصل ہے۔

جنوبی ہند کے نوابوں نے سترہویں اور اٹھارویں صدی میں، تامل ناڈو کے کچھ علاقوں میں فارسی اور اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فارسی اصطلاحیں زبان زدِ خاص وعام ہوگئیں۔ جن میں سے بے شمار اصطلاحیں آج بھی مقبول عام ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق آج ۲۰۰ سے ۳۰۰ خالص فارسی الفاظ اور اُن سے کچھ کم زیادہ عربی اور اردو کے الفاظ عوامی زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔

شمالی ہند سے آکر تامل ناڈو کے مختلف علاقوں میں سکونت اختیار کرنے والے باشندوں کی یہ خصوصیت تھی کہ یہ لوگ بہ یک وقت تین زبانوں یعنی اردوئے قدیم، عربی اور فارسی پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی زبان تامل بھی سیکھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اہلِ شمال اور ان کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے تمل عوام جہاں اپنی لسانی قابلیت کے بل بوتے پر مختلف ادبیات

کا مطالعہ کرتے وہیں طبع زاد کتابیں لکھنے کے علاوہ فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے اپنی زبان میں کرنے کی سعی کرتے۔ چنانچہ مولانا روم اور عمر خیام کے ترجموں کی ایک مستقل روایت یہاں موجود ہے۔ ان کے علاوہ سعدی، جامی، انوری، خاقانی، حکیم سنائی، فیضی، امیر خسرو اور فرید الدین عطار وغیرہ کے چیدہ چیدہ کلام کا ترجمہ بھی ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے ترجمے شوق سے کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے ترجموں کا سوال ہے اس کا اولین ترجمہ مدورائی کے سید احمد مہدی نے کیا ہے، اُن کا نام سید احمد (پ ۱۹۰۷) اور تخلص مہدی تھا۔ ۱۹۲۸ء میں آپ مدورائی کے ایک اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ ان کی مادری زبان اردو تھی مگر تامل پر قابل فخر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ تامل اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اسلامی تاریخ سے خصوصی دلچسپی ہونے کے باعث وہ تامل مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کا شعور پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ قوم کی اصلاح کی فکر بھی دامن گیر تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے شاعری بھی کی۔ افسانے بھی لکھے اور رسائل بھی نکالے۔ ظاہر ہے اقبالؔ کے ترجموں کا محرک بھی یہی جذبہ رہا ہوگا۔ تاہم ایک اور وجہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سید احمد مہدی کو جگرؔ مرادآبادی اور سیمابؔ اکبرآبادی کے ساتھ مراسم تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی ایک یا دونوں نے اس طرف اُن کی توجہ مبذول کرائی ہو۔ لیکن سب سے بڑی وجہ اُن کے گھر کا ماحول معلوم ہوتا ہے۔ موصوف کے والدِ محترم سید اشرف صاحب مرحوم اردو اور فارسی کے استاد تھے جو مدورائی جیسے خالص تامل علاقے میں ان زبانوں کے چراغ روشن کیے ہوئے تھے۔ ہو نہ ہو یہ تحریک انہیں اپنے والد ہی سے ملی ہو۔

سید احمد مہدی نے شکوہ، جواب شکوہ، قومی ترانہ، بچے کی دعا اور چیدہ چیدہ کئی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمے منظوم ہیں اور کلاسیکی تامل کے اسلوبِ بیان کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کے کچھ نمونے ان کے فرزند اور تامل کے ملک الشعراء اور تامل ناڈو وقف بورڈ کے موجودہ چیرمین ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے پاس محفوظ ہیں۔ سید احمد کی وفات ۱۹۷۴ میں ہوئی۔ وفات سے چند ماہ قبل، نیو کالج، چینائی میں اسلامیہ تامل ایلکّہ ماناڈو میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خدمت میں اعزاز پیش کیا گیا تھا۔ (تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو، منی ولاملر، نوویناپریس، ٹریپلکین،

چینائی ص ۵، ۱۹۹۸ء)

دوسرا نام سید ابراہیم کا ہے، جو جمال محمد کالج، ترچناپلی سے منسلک تھے۔ علامہ اقبال پر ان کی کتاب کا تیسرا ایڈیشن جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ میری نظروں سے گذرا، اس کتاب میں کل ۶۴۔ صفحات ہیں، نام کا ورق ندارد، سائز ڈیمائی ہے۔ اس کتاب میں صرف شکوہ اور جوابِ شکوہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کثرت سے فٹ نوٹ دیے گئے ہیں۔ لگتا ہے یہ فٹ نوٹ اردو والوں کے علاوہ غیر مسلموں کو ذہن میں رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اصطلاحوں، شخصیتوں، پہاڑوں اور مقاموں وغیرہ کو نہایت صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآنی آیات کے ترجمے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

تیسرا نام آر۔ پی۔ یم غنی کا ہے جو عمر خیام اور رومی کے ترجموں کے لیے مشہور ہیں۔ غنی نے پہلے اقبال کی حیات اور ان کے ترجموں پر مبنی دو کتابچے بنام علامہ اقبال اور اقبال کوی امودم شائع کیے تھے۔ یہ اتنے مقبول ہوئے کہ ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ لہذا دوستوں نے انھیں دوبارہ چھاپنے کا مشورہ دیا۔ لیکن غنی نے انھیں دوبارہ چھاپنے کے بجائے ایک نئی کتاب ہی لکھ ڈالی جو ان دونوں کتابوں کا مجموعہ ہونے کے باوصف ان سے زیادہ معلوماتی اور ضخیم تھی۔ کتاب کا نام رکھا، مہاکوی اقبال (دیکھیے کتاب کا پیش لفظ) یہ کتاب ان کی زندگی میں ایک بار شائع ہوئی اور ۲۰۰۶ء میں ان کے انتقال کے کئی دنوں کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن اور نیشنل پبلیشرز چینائی کی کوششوں سے دوبارہ شائع ہوئی۔ تمل میں اقبال پر یہ سب سے ضخیم کتاب ہے۔ ۲۰۸ صفحات کی یہ کتاب ڈیمائی سائز میں شائع ہوئی ہے اور بازار میں دستیاب ہے۔

آر پی یم غنی کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے کلام اقبال کا سب سے زیادہ ترجمہ کیا ہے۔ بانگِ درا سے ہمالہ، ترانہ، ہندی، تصویر درد، جگنو، حقیقتِ حسن، علی گڑھ کے طلباء کے نام، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، خضر راہ وغیرہ کا ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے دوسرے تمام مجموعوں سے منتخبہ نظموں اور چیدہ چیدہ اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ تمام ترجمے ان کی کتاب، مہاکوی اقبال میں شامل ہیں۔ ترجموں کے علاوہ اس کتاب میں اقبال کی زندگی کے مختصر حالات پیش کرنے کے باوصف ان کے ہم افکار کا ایک جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

کوئمبتور میں مجھے ایک کافی پرانی کتاب دیکھنے کو ملی۔ لگتا ہے کہ کچھ آدھی صدی سے پہلے کی اشاعت ہے۔ ناقص الاول اور ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے مصنف کا نام، پبلیشر کا پتہ یا سنہ اشاعت کا علم نہ ہو سکا۔ ۶۷ صفحات کی یہ کتاب ڈیمائی سائز میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ جس میں اقبال کی چار نظموں، شکوہ، جوابِ شکوہ، ترانۂ ملی، اور ترانۂ ہندی کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اردو کا متن بھی دیا گیا ہے۔ اس کے بعد نیچے اردو متن کو تامل رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ بعد ازاں اس کا تامل ترجمہ مرقوم ہے۔ مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ تامل نہ صرف ترجمہ پڑھیں بل کہ اردو متن کی قرأت بھی کریں۔ یہ کتاب فیض قادری کوئمبتور کے پاس محفوظ ہے۔

تامل ناڈو میں اردو زبان وادب کے فروغ میں شہر وانم باڑی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ صوبے کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں یہاں اردو شعر وادب کے چرچے زیادہ رہتے ہیں۔ اردو تعلیم کا معیار بھی خاصا بلند ہے۔ ۷۸۔۱۹۷۷ عیسوی میں، جب ملک بھر میں اقبال صد سالہ تقریبات منائی گئیں تو اسلامیہ کالج، وانم باڑی میں بھی، اُس وقت کے کالج سکریٹری اسانگنی نذیر احمد مرحوم کی قیادت میں ان تقریبات کا جس شاندار پیمانے پر اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی مثال ہندوستان میں شاید ہی کہیں دیکھی گئی ہوگی۔ ان تقریبات کے دوران میں اقبال پر تامل زبان میں بہت کچھ لکھا گیا اور کہا گیا۔ مقالات اور تقریروں میں اقبال کے بیسیوں اشعار کے ترجمے پیش کیے گئے۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اقبال کے ۵۵ منتخبہ اشعار کا ترجمہ تامل میں کر کے ایک کتابچے کی شکل میں سامعین میں تقسیم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اس وقت اسلامیہ کالج کے صدر شعبۂ تامل تھے۔ انھیں ترجمے کا یہ کام تفویض کیا گیا تھا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھے ان کے تعاون کے لیے کالج کی طرف سے نامزد کیا گیا تھا۔ میں نے اور ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب نے اشعار کا انتخاب کیا اور ان کا سلیس اور عام فہم تامل میں ترجمہ کیا تھا۔ ان اشعار میں سے ۲۱ منی ولاملر (کتاب مذکور) میں بھی شامل ہیں۔

صد سالہ تقریب کے خصوص میں جو سمینار تامل زبان کے لیے مختص تھا۔ اس میں مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات میں اقبالؔ کے کلام کے ترجمے پیش کیے تھے۔ پروفیسر کرشن مورتی،

ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، الیا نگڑی نے ایک مقالہ، اقبال ورد و پر چی کو ینجر، (اقبال ایک شاعرِ انقلاب) میں اقبال کے ان اشعار کا ترجمہ پیش کیا جن میں اقبال کا رنگِ احتجاج جھلکتا تھا۔ اسی طرز کا ایک اور مقالہ لیس سبا نائیگم، قادر محی الدین کالج، ادیرام پٹنم نے بھی پیش کیا تھا۔ اسی کالج کے صدر شعبۂ تامل ایم عبدالکریم نے اپنے اپنے مقالے، اقبال ان لکشیہ سندنئ گل (کلامِ اقبال میں مقصد حیات کے افکار' میں اقبال کے ان اشعار کا احاطہ اور ترجمہ کیا ہے جن میں اقبال نے پیغام عمل دیا ہے۔ اس وقت تامل میں جو تقریریں کی گئیں ان میں اقبال کے اشعار کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے اس کے ٹیپ (tape) اسلامیہ کالج میں تا حال موجود ہوں۔ میں نے اسلامیہ کالج کے میرے دوست واحباب سے گزارش کی ہے کہ اقبال صد سالہ تقریبات کی تمام تفصیلات کو یکجا کر کے ایک مستقل کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیں۔ یہ کام مطالعاتِ اقبال میں اضافے کا باعث ہوگا۔ دیکھیں خاکسار کی دعا کب قبول ہوتی ہے۔

نریام پیٹ آمبور سے بیس پچیس کلومیٹر کی دوری پر سو ڈیڑھ سو گھروں پر مبنی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے جغرافیہ میں ایک چھوٹی سی سڑک ہے۔ جس پر آمبور عمر آباد اور ویلور وغیرہ کی بسیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اسی سڑک سے ملحق ایک کوچے کے دوسرے گھر میں نریام پی سلام (پ ۱۹۴۷) بیٹھے ہوئے فارسی اور اردو کتابوں کا ترجمہ تامل میں کرتے رہتے ہیں۔ پیشہ سے تاجرِ چرم ہیں مگر اُن کا سارا وقت ترجمہ نگاری میں صرف ہوتا ہے۔ موصوف نے مثنوی مولانا روم کی پانچ جلدوں کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۰ء کو جب میں اُن سے ملنے کے لیے اُن کے مکان پر گیا تو وہ مثنوی کی چھٹی جلد کا ترجمہ کر رہے تھے۔ جہاں تک اقبال کے ترجمے کا تعلق ہے سلام نے چند نظموں مثلاً شکوہ، جوابِ شکوہ، بچے کی دعا، ترانۂ ملی، ترانۂ قومی، ایک مکڑا اور مکھی وغیرہ کے علاوہ کئی قطعات کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کلام تامل ناڈو وقف بوڈ کے ماہ نامے، اسی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے۔

تمل انبن کا شمار تامل کے صفِ اول کے جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کا وطن ای روڈ ہے۔ مگر وہ برسوں سے چینائی میں مقیم ہیں۔ تامل کے کلاسیکی شعر و ادب کا نہایت ژرف بینی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ موصوف نے اقبال کے ترقی پسند خیالات سے متاثر ہو کر ایک طویل مضمون

تحریر کیا ہے۔ مضمون میں اقبال کے بے شمار اشعار کو بہ طورِ مثال پیش کیا ہے۔ چوں کہ اردو سے وہ ناواقف ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے مضمون اور ترجمے کا سارا مواد انگریزی سے اخذ کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ ترجمہ انگریزی کے توسط سے کیے جانے کے باوجود قاری کو متاثر کرتا ہے۔

تمل انبن نے ایک کتاب ''بعنوان''، سگر نگل میل وریم سری گ گل (پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھیلنے والے پر) لکھی ہے جس میں دنیا کے چند معروف ومقبول شاعروں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ، اُن کے بہترین کلام کا ترجمہ تامل میں پیش کیا ہے۔ اقبال پر ان کا مضمون اسی کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کی اشاعت ۲۰۰۴ میں پوم پگارم چینائی میں عمل میں آئی۔ تمل انبن کے علاوہ ،تامل کے ایک اور معروف غیر مسلم شاعر پُل وَر۔ تا گوندن نے شکوہ اور جواب شکوہ کا ترجمہ کیا ہے۔

کوئمبور کے ایک ابھرتے ہوئے تامل اور اردو کے شاعر وادیب فیض قادری (پ ۱۹۷۸) نے بھی اقبال پر ایک مختصر سی کتاب ''اوردان اُلگا مہا کوی۔۔۔ اقبال (یہی ہیں دنیا کے شاعرِ اعظم۔۔۔ اقبال) لکھی ہے۔ جسے انجمن اردو کوئمبور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ مقصدِ تحریر ہے، نئی نسل میں اقبال فہمی پیدا کرنا، اس کتاب میں اقبال کے مختصر حالاتِ زندگی کے علاوہ ان کے منتخبہ اشعار کا ترجمہ شامل ہے۔ فیض نے بنگلور یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان کامیاب کیا ہے۔ مادری زبان اردو ہے مگر تامل پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں دونوں زبانوں میں ایک دوسرے سے ترجمہ کرنے کا شوق بھی ہے جو بے پایاں ہے۔ کچھ دن قبل انھوں نے اردو ادب کی مختصر تاریخ تامل زبان میں لکھی ہے۔ جسے نیشنل پریس چینائی نے ۲۰۰۸ میں شائع کیا ہے۔ سرِ دست وہ شکوہ اور جواب شکوہ کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ میں نے اپنے قیام کوئمبتور کے دوران میں اس ترجمے کے کچھ حصے دیکھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ فیض کا یہ ترجمہ اب تک کے تمام ترجموں سے بہتر ثابت ہوگا۔

ان دستیاب کتابوں اور مضامین کے علاوہ کچھ اور کتابوں کے بارے میں ادھر ادھر کتابوں میں مرقوم ہے۔ کچھ ترجموں کے بارے میں صرف سنا ہے۔ ان تک ہماری رسائی

سردست ممکن نظر نہیں آتی ہے۔ مثلاً تامل کے معروف شاعر بدرالدین (چینائی) نے کہا کہ انھوں نے تقریباً تیس سال قبل کنل کریم نامی ایک شاعر کی کتاب بعنوان ''اقبال وڈیے کوی دگل (اقبال کی شاعری) دیکھی تھی۔ کنل کریم کا تعلق ملیشیا سے ہے۔ اُن کی مذکورہ کتاب چینائی سے شائع ہوئی تھی۔ اب کہیں دستیاب نہیں ہے۔ اسی طرح کا۔ مو۔ مصطفیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اسرارِ خودی کا مکمل ترجمہ کیا ہے۔ مگر بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ تامل کے اسلامی رسائل میں بھی اقبال کے ترجمے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور انہیں یک جا کرنے کیلئے وقت درکار ہے۔ قبل ازیں کہ یہ سرمایۂ ادب صفحۂ ہستی سے مٹ جائے ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں ڈھونڈ نکالیں انھیں دنیا کے سامنے لائیں اور اُن کی حفاظت بھی کریں۔

تنقیدی جائزہ

فارسی شعراء خاص طور پر رومی اور عمر خیام کے ترجموں کے مقابلے میں اقبال کے ترجمے کم بھی ہیں اور وہ مکمل بھی نہیں ہیں۔ اقبال کے کسی بھی مجموعے کا مکمل ترجمہ مجھے نہیں ملا۔ جو کچھ ترجمے ملے، وہ غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار کے علاوہ بعض معروف نظموں کے ترجمے ہیں۔ کچھ مقالات بھی دیکھے ہیں جو اقبال کے افکار کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اقبال کی مقبول نظموں میں شکوہ، جوابِ شکوہ، ترانۂ ہندی، ترانۂ ملی، بچے کی دعاء، ایک آرزو، وغیرہ کا ایک سے زیادہ شعراء نے تامل میں ترجمہ کیا ہے۔ کچھ دوسری نظمیں مثلاً عقل و دل، چاند اور ستارے، عاشق ہرجائی، پہاڑ اور گلہری، ایک مکھی اور مکڑا، ہندوستان بچوں کا قومی گیت، ہمالہ، جگنو، حقیقتِ حسن، طلبائے علی گڑھ کالج کے نام، خضرِ راہ اور قطعاتِ اقبالؔ وغیرہ کا ترجمہ عوام و خواص میں پسند کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ کے فلسفۂ خودی پر مبنی اشعار کے ترجمے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔

یہ ترجمے تین طرح کی شعری ہیئتوں میں کیے گئے ہیں۔ سب سے قدیم ترجمے منظوم ترجموں کے قریب ہیں جن میں کہیں کہیں ردیف و قوافی کی پابندی بھی دیکھی گئی ہے۔ تاہم یہ التزام تمام ترجموں میں نہیں ہے۔ اس خصوص میں سید احمد مہدی، آر، پی، یم، غنی اور ایک گم نام

شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ نریام پیٹ سلام نے اردو کی پابند ہیئتوں کو تامل برقرار رکھا ہے۔ مسدس کی شکل میں، غزل کو غزل کی ہیئت میں اور مثنوی کو مثنوی کی صورت میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے، کیوں کہ ردیف و قافیے کی پابندی کی صورت میں مفہوم شعر کے دگرگوں ہونے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ سلام کا ترجمہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ کہیں کہیں انھیں بھی ٹھوکر کھانی پڑی ہے۔ ترجمے کی تیسری ہیئت آزاد یا نثر نظم کی ہے۔ اس ضمن میں کوی کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن، سید ابراہیم، تمل انبن، آر، پی۔ ایم غنی اور فیض قادری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آزاد نظم کی ہیئت میں کیے گئے ترجموں میں جو اثر انگیزی پائی جاتی ہے وہ دوسروں میں قال قال ہی دکھائی دیتی ہے۔

کچھ ترجمے راست نوعیت کے ہیں، یعنی اردو سے تامل میں کیے گیئے ہیں اور کچھ بالراست یعنی انگریزی سے جن لوگوں نے راست اردو ترجمے کیے ہیں وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں سے بہ خوبی واقف ہیں یا کم از کم ان کی مادری زبان اردو ہے۔ چنانچہ اقبال کو سمجھنا اُن کے لیے ویسا دشوار نہ تھا جیسے انگریزی سے ترجمہ کرنے والوں کے لیے تھا۔ اس وجہ سے اُن کے ترجموں میں زیادہ جھول دکھائی نہیں دیتا۔ اور اگر کہیں جھول ہے بھی تو اُس کی وجہ زبان کی ناواقفیت نہیں ہے بلکہ شعری ہیئتوں کی پابندی کرنے کا شوق ہے۔

جن لوگوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ترجموں میں بہت احتیاط برتی ہے اور لب و لہجے کا حتی المقدور خیال رکھا ہے۔ لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے اردو دوستوں سے صلاح مشورہ بھی کیا ہے۔ تاہم ان شعراء نے اقبال کی پُرشکوہ زبان کے نعم البدل کے لیے تامل کے کلاسیکی الفاظ کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں ترجمہ اصل سے دور جا پڑا ہے اور کہیں کہیں پھس پھسا ہو گیا ہے۔ سید ابراہیم کا ترجمہ بھی کوتاہیوں سے پاک نہیں ہے۔ مجموعی طور پر ان کی کوششوں کو سراہنا چاہیے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی کچھ عام مشکلات ہوتی ہیں۔ ان سے مفر نہیں ہے۔ تامل میں اقبال کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجموں کو ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان میں چند کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ اردو شاعری کے تصورات حسن و عشق تامل شاعری

کے تصوراتِ حسن وعشق سے یکسر الگ ہیں۔ اُن کے یہاں حسن وعشق کا تصور وہ نہیں ہے جو ہمارے یہاں ہے۔ یہی وجہ ہے تامل میں حسن اور عشق کے لیے جو الفاظ ملتے ہیں وہ اردو کے تصور حسن وعشق کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ حسن کے لیے تامل میں لفظ، الکیہ مستعمل ہے جس کا مطلب ہے خوب صورتی، ظاہر ہے کہ تامل کے اس لفظ سے، حسن کے پورے معنیٰ ادا نہیں ہو پاتے۔ اسی طرح عشق کے لیے تامل میں دو لفظ، کادل اور انبو مستعمل ہیں۔ کادل کا مطلب پیار اور انبو کا قریبی مطلب محبت ہے۔ یہ دونوں لفظ عشق کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ فیض قادری نے البتہ عشق کے لیے ایک نئی ترکیب، تی ورا کادل، وضع کی ہے جس کا مطلب ہے ''شدید پیار'' اردو میں یہ ترکیب اٹ پٹی سی لگتی ہے۔ لیکن تامل میں یہ نئی ترکیب بڑی حد تک عشق کی ترجمانی کرتی ہے۔ کم سے کم وہ انبو اور کادل سے تو بہتر ہے۔

شاہین کے لیے تامل میں لفظ 'راجہ لی' موجود اور مستعمل ہے۔ اکثر مترجموں نے راجہ لی ہی استعمال کیا ہے۔ مگر فیض قادری نے ''شاہین پُرویی' یعنی شاہین پرندہ استعمال کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ''شاہین اقبال کی ایک اہم علامت ہے، اُسے جوں کا توں استعمال کرنا چاہیے۔ خودی کے لیے دو لفظ، اگم اور سویم' استعمال ہوتے ہیں۔ اگم کا مطلب باطن ہے جس کی ضد 'پرم' یعنی ظاہر ہے۔ آر پی۔ یم غنی اور سید مہدی نے خودی کے لیے اگم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جب کہ بعد کے مترجموں نے سویم کا لفظ استعمال کیا ہے جو خودی سے بہت قریب ہے۔

آہِ صبح گاہی، یا آہ سحر کا ترجمہ بھی تامل میں مشکل ہے۔ ان کا ترجمہ اَندی گن نیر (تہجد کے وقت کے آنسو) کیا جاتا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ تو ہو سکتا ہے مگر ان کی معنویت وہی نہیں ہے۔ نالہ کا ترجمہ پلم بل، (بڑبڑانا) یا اَل گئی، کرتے ہیں ظاہر ہے یہ دونوں لفظ معنوی اعتبار سے نالہ سے دور ہیں۔ اسی طرح نظارے کے لیے درشن یا' کاچی' جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو نظارے کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتے۔ ساقی کے لیے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک مذکر، مدھو وار پول، اور دوسرا مونث، مدھو اور پول وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ ساقی میں جو معنوی گہرائی و وسعت ہے وہ ان الفاظ میں نہیں آسکتی۔ ذوق اور شوق جیسے الفاظ کے لیے تامل میں متبادل الفاظ نہیں ملتے۔ شوق کے لیے آروم، اور ذوق کے لیے۔ پیرِ آروم، مستعمل ہیں۔ کہیں ذوق کو طاقت یا قوت کے

معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بہر کیف تامل کے مترجموں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اقبال کے مفاہیم شعری مجروح نہ ہونے پائیں۔

یہ رہی اقبال کے ترجمے کی بات، اب آیئے تامل کے دو شاعروں کا ذکر کریں، جنھوں نے اقبال کے زیرِ اثر نظمیں لکھیں۔ بھارتی یار کا مقام تامل میں وہی ہے جو اقبال کا اردو میں ہے۔ بھارتی یار نے ترانۂ ہندی لکھا ہے جو تامل کے عوام میں ویسا ہی مقبول ہے جیسا کہ اردو میں اقبال کا ترانۂ ہندی، بھارتی یار نے اپنا ترانہ اقبال کے ترانۂ ہندی کو سن کر لکھا تھا۔ بھارتی یار کے علاوہ تامل کے ایک جدید شاعر بدرالدین نے شکوہ کے طرز پر ایک نظم لکھی ہے جو مقبول خاص وعام ہے۔

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ تامل عوام اور شعراء اقبال کو سمجھنے اور اُن کے کلام کا بہتر سے بہتر ترجمہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اقبال کے کلام کو تامل عوام کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ ڈاکٹر کوی، کو عبدالرحمان کے اس قول سے ہوتا ہے۔

اردو شاعری ایک خوب صورت اور نازک حسینہ تھی۔ اقبال نے اس کے ہاتھ میں تلوار تھما کر اُسے بہادر بنا دیا ہے۔

☆☆☆

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را ببینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفٰے پنہاں بگیر
اقبالؔ

☆☆

کے' پی' شمس الدّین
ترورکاڈ (کیرالا)

ملیالم میں اقبالیات

کے' پی' شمس الدّین ترورکاڈ (کیرالا)

ہندوستان میں شاید ہی ایسی کوئی ریاست ہو جس کا اقبالیات سے تعلق نہ ہو۔ ہندوستان کی سبھی ریاستوں میں اردو لکھنے' پڑھنے' بولنے اور سمجھنے والوں کی آبادی ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ایسے صوبوں میں اقبالیاتی ادب کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد بھی ہوگی۔ علامہ اقبال کے افکار اور اشعار کا مفہوم سمجھنے کے لیے فارسی' عربی اور اردو واقفیت رکھنا ضروری ہے۔ صرف علامہ اقبال کے شعری افکار کو سمجھنے کے لیے اردو اور فارسی سیکھنے والے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ایسے مقامات پر اقبالیات سے واقفیت کے لیے ترجمہ کا سہارا لیا گیا اور یہ ترجمہ انگریزی سے مقامی زبانوں میں کیا گیا تھا۔ جس سے اقبالیاتی ادب کو مکمل طور پر سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی اس دشواری کو دور کرنے کے لیے محبان اقبال اردو اور فارسی کی طرف راغب ہونے لگے۔

کیرالا ایک ایسی ریاست ہے جہاں دوسری ریاستوں کے مقابلے میں اردو کا رواج بالکل کم ہے یا نہیں کے برابر ہے کیوں کے یہاں ہر عام وخاص لوگوں کی بولی چاہے وہ کسی بھی مذہب یا ذات سے وابستہ ہوں ملیالم ہے۔ ظاہر کہ ایسی ریاست میں اردو کا پنپنا مشکل کام ہے۔ بیسویں صدی میں دینی علوم حاصل کرنے کی غرض سے لوگ دارالعلوم دیوبند' ویلور کے مدرسۃ الطیفیہ 'باقیات صالحات عمرآباد کے جامعہ دارالسلام' مدراس جمالیہ عربی کالج جیسے دینی اداروں سے وابستہ ہونے لگے۔ وہاں سے جب وہ مولانا' مولوی فاضل بن کر کیرالا پہنچے تو اردو بھی ساتھ لائے تھے ظاہری بات ہے کہ علامہ اقبال کا کلام بھی ان کے ساتھ کیرالا پہنچنے لگا۔

علامہ اقبال کی حیات ہی میں کیرالا اقبالیات سے آشنا ہونے لگا۔ اس سلسلے میں اقبال پر شائع شدہ پہلا مضمون کون سا ہے یا اقبال کی کس نظم کا ترجمہ ملیالم میں پہلی بار ہوا ہے کہنا مشکل ہے لیکن

اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی حیات ہی میں ۱۹۳۲ء میں کالی کٹ سے ملیالم میں ایک مجلّہ 'اقبال ٹیگور گرنتھاولی' کے نام سے شائع ہونے لگا اس مجلّہ کی اشاعت کا مقصد علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات کے ذریعے مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس کے پبلیشر کے انتقال کے بعد یہ مجلّہ بند ہو گیا۔ اس کے کل ۴۷ شمارے شائع ہوئے تھے۔

مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کام کرنے والے اور تحریک آزادی کے مرد مجاہد محمد عبدالرحمٰن صاحب نے ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں عید میلاد النبی کے موقع پر 'الامین' کے نام سے کیرالا میں ایک اخبار جاری کیا تھا جو بہت شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس میں ہمیشہ انگریزوں کے خلاف مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس اخبار پر ہمیشہ پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں 'الامین' نے ایک ضخیم خصوصی شمارہ شائع کیا تھا اس شمارے میں اے ایم عبدالقادر نے اقبال پر ایک طویل مضمون 'بھارادتِلے ابھی نوا مسلم کوی' (بھارت کا جدید مسلم شاعر) کے نام سے شائع کیا تھا۔ 'الامین' میں اردو اخباروں میں شائع شدہ خبروں اور مضامین کے ملیالم ترجمے شائع ہوا کرتے تھے اس میں اقبال سے منسوب مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

۲۶/ مارچ ۱۹۳۲ء میں کیرالا کے ایک اہم تاریخی تجارتی شہر 'تلاشیری' سے شائع ہونے والا روزنامہ 'چندریکا' ایک مسلم اخبار کی حیثیت سے کیرالا میں بہت زیادہ شہرت حاصل کرنے والا پہلا اخبار تھا۔ یہ مسلم لیگ کا ترجمان بھی ہے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں تلاشیری سے کالی کٹ کے مقام پر تبدیل کر کے، 'مسلم پرنٹنگ اینڈ پبلیشنگ کمپنی لیمیٹیڈ' سے اشاعت کیا جانے لگا۔ ملیالم کے اخبارات میں سب سے زیادہ علامہ اقبال پر مضامین اور علامہ اقبال کی تخلیقات کے ملیالم تراجم بھی چندریکا ہی میں شائع ہوئے۔

انصاری، یواکیسری، چنداگن جیسے کئی ماہناموں کے سرورق پر علامہ اقبال کی تصویر کے ساتھ ساتھ اقبال پر مضامین بھی شائع کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۸ء ترونند پورم سے شائع ہونے والا ملیالم رسالہ 'نواجیون' میں علامہ اقبال کی پہلی برسی کے موقعہ پر ۱۹۳۹ء میں ملیالم کے مشہور ادیب وئیکم محمد بشیر کا خصوصی مضمون 'اقبال نمو کو مرد اسنجیونی' (اقبال ہمارے لیے امرت) کے عنوان سے شائع ہوا۔ ملیالم کے مسلم روزنامہ، ہفتہ روزہ اور ماہناموں میں وقتاً فوقتاً علامہ اقبال پر مضامین شائع

ہوا کرتے تھے۔ مضمون نگاروں میں غیر مسلم بھی تھے۔ مئی ۱۹۴۱ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ 'ماپلا ریویو' کے چوتھے شمارے میں 'سر محمد اقبال' کے عنوان سے گٹونی راجہ کا مضمون اس کی ایک مثال ہے۔ اس شمارے میں ملیالم کے نامور ایب اُلّور پرمیشور ائیر نے اقبال اور ٹیگور کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کو 'مہاکوی' (عظیم شاعر) کہا ہے۔

۱۹۳۶ء میں کوچین میں قائم کی گئی 'اقبال لائبریری اینڈ ریڈنگ روم' نے پہلی مرتبہ آقبال کی تخلیق کو ملیالم میں شائع کیا۔ یہ علامہ آقبال کے فارسی کلام 'اسرارِ خودی' کا ملیالم ترجمہ تھا۔ وگم ایم عبدالقادر کی ترجمہ کردہ ۱۵۵ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ 'آتمارہسیہ نگل' کے نام سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا پیش لفظ ملیالم کے جانے مانے ادیب و قلمکار جی شنکرا کُروپ نے لکھا تھا۔

ملیالم زبان میں علامہ آقبال پر پہلی کتاب ۱۹۴۶ء میں 'آقبال کے نام سے تصنیف کی گئی اس کتاب کے خالق وگم ایم عبدالقادر ہی تھے۔ ۱۹۵ صفحات اور ۲۵ ابواب پر مشتمل یہ کتاب آقبال کے فلسفہ کے متعلق ہے۔ کیرالا کے ملیالی لوگ آقبال کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک حد تک کارآمد ثابت ہوئی اور اسی کتاب سے کیرالا میں اقبالیاتی ادب کا آغاز ہوا۔ اس کتاب کے ساتھ ساتھ وگم ایم عبدالقادر نے 'رموزِ بے حودی' کا آتمانویدِ ننگل' کے نام سے بھی ترجمہ کر کے شائع کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ کوششوں کے باوجود اس کا نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا۔

کیرالا کے تلاشیری میں مقیم ملیالم کے موپلا شاعر مترجم اور عربی ملیالم زبان کے ماہر، اوہ ابو صاحب علامہ آقبال کے بہت شیدائی اور دلدادہ تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں خضرِ راہ' کا 'جیویدارہ سئیم' کے نام سے ملیالم میں ترجمہ کیا۔ ان دنوں علامہ آقبال پر سب سے زیادہ لکھنے والی شخصیت ایم ابوبکر منشی فاضل صاحب تھے۔ روزنامہ 'الامین' اور 'چندریکا' میں ابوبکر صاحب مسلسل لکھا کرتے تھے۔ اوہ ابو صاحب کی اس کتاب کے لیے پیش لفظ ایم ابوبکر منشی فاضل نے ہی لکھا تھا۔ ۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ترشور سے 'آمنہ بکس' نے شائع کیا تھا۔ اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اوہ ابو صاحب نے ہی 'علامہ آقبال کے خطوط بنام محمد علی جناح' کا ملیالم میں 'اقبال نڈے کتو گل' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے ۱۸ خطوط کا ترجمہ ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی ترشور کے 'آمنہ بکس' نے ہی پبلش کیا تھا۔

کیرالا میں مسلمان ہی نہیں غیر مسلمان بھی علامہ اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اے مادھون نے اپریل ۱۹۶۱ء میں 'اقبال' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کو اقبال پر غیر مسلم کی لکھی گئی پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ ۱۰۳ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایرنا کلم کے 'تلا گم پبلی کیشنز (کوچین) نے شائع کیا۔ جس میں اقبال کی مختصر سرگذشت ہے۔

علامہ اقبال کا 'شکوہ جواب شکوہ' کو کیرالا میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ملیالم میں اس کا ترجمہ کئی لوگوں نے کیا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں تلاشیری کے سی سی ایم صالح نے لفظ بہ لفظ 'شکوہ' کا ترجمہ 'پرادھی گل' کے نام سے شائع کیا۔ ۱۸ صفحات کے اس کتابچہ کا پبلیشر تلاشیری کے 'فاطمہ بک اسٹال' ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۴ صفحات کا کتابچہ 'پرادھی گل کو مروپڑی' بھی شائع کیا۔ یہ 'جواب شکوہ' کا ترجمہ تھا اسے بھی 'فاطمہ بک اسٹال' نے ہی شائع کیا۔

ضلع کاسرگوڈ سے موپلا شاعر اور عربی کے استاد جناب ٹی عبید صاحب بھی 'شکوہ جواب شکوہ' کا ترجمہ کیا۔ اس منظوم ترجمہ کو ادبی دنیا میں سبھی نے سراہا۔ ۸۷ صفحات کے اس کتاب کے لیے مشہو رصحافی کے ایم احمد نے طویل پیش لفظ لکھا ہے۔ اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب کو' آولادی یوٗم مروپڑی یوٗم' کے نام سے آگست ۱۹۷۳ء میں کوٹائم سے 'نیشنل بک اسٹال' نے شائع کیا۔

نومبر ۱۹۷۶ء میں 'اقبال کو یدائیلے' جیودادرشنم' (اقبال کی نظموں میں حیات بصارت) کے نام سے محمد نلمبور نے اقبال پر ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کو بھی 'نیشنل بک اسٹال' والو نے ہی شائع کیا۔ ۱۴۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بھی قارئین کے لیے ایک انوکھی کتاب ہے۔ اس کے ابواب حیات 'غم' موت 'روح' ڈر وغیرہ عنوانات پر مشتمل ہے۔

کالی کٹ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر متعدد کتابوں کے مصنف اور 'کیرالا اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف لینگو یجس' کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اے این پی عمر کٹی نے ۱۹۷۶ء میں 'تجدید فکریات اسلام' کا ملیالم میں ترجمہ کیا۔

'مداچند اگلوڈے پُنا سمویدائم اسلامل' کے نام سے شائع ہ اس کتاب کا پیش لفظ ایک غیر مسلم ڈاکٹر ویلا یودھن نائر نے لکھا ہے۔ ۲۵۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب تروننتد پورم سے 'اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف لینگو یجس' نے ہی شائع کیا ہے۔ ابواب کے ترجمہ کے علاوہ علامہ اقبال پر ڈاکٹر عمر کٹی کا

ایک مضمون بھی ہے۔اس کتاب کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

علامہ اقبال کی پیدائش کا صد سالہ جشن کیرالا میں بھی بڑے جوش وخروش سے منایا گیا۔ کیرالہ کے ایک ضلع آلا پوژہ (آلپی) میں واقع 'اقبال لٹریری سوسائیٹی' نے اس موقع پر ۹۰ صفحات پر مشتمل ایک شاندار مجلّہ شائع کیا تھا۔'اقبآل سوئنیر' کے نام سے شائع شدہ مجلّہ میں ایچ ایم صالح' ڈاکٹر ایم ایم حسن' پروفیسر محی الدّین شاہ' جیسی شخصیات کے مضامین کے ساتھ ساتھ پروفیسر آر راماورماتمبوران کا 'اقبال نڈے درشنم' (اقبال کی بصارت) کے عنوان سے بھی ایک مضمون تھا۔اس کے علاوہ اقبال کی' نظموں کے ملیالم تراجم' بھی اس میں تھے۔

کیرالا کے اردو اساتذ کی واحد انجمن کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسیشن کا ترجمان 'اردو بلٹن' کا تیسرا شمارہ دسمبر ۱۹۸۴ء میں علامہ اقبآل پر خصوصی شمارہ شائع کیا تھا۔۴۰ صفحات پر مشتمل یہ 'اردو بلٹن' کالی کٹ سے شائع کیا گیا تھا۔آج بھی سہ ماہی 'اردو بلٹن' میں وقتاً فوقتاً اقبآل پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مئی ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر اے این پی عمر کٹی صاحب مظفر حسین برنی صاحب کی لکھی گئی کتاب 'محبّ وطن علامہ اقبال' کا ملیالم ترجمہ کر کے شائع کیا۔اسے کیرالا ساہتیہ اکیڈمی ترشور نے پبلش کیا۔ ۷۰ اصفحات پر مشتمل اس کتاب کا نام 'اقبال راجیہ سنیہی یا یہ کوی' ہے۔

روزنامہ 'چندریکا' اور ہفتہ روزہ 'چندریکا' میں علامہ اقبال پر مضامین تو شائع ہوتے ہی رہتے تھے لیکن ۸۰ کی دہائی میں 'چندریکا' میں مسلسل اقبال پر مضامین شائع ہو رہے تھے۔جو سب کی توجہ کا مرکز بن رہتے تھے۔ہر کوئی اس قلمکار کو جاننا چاہتا تھا مسلسل اقبآل پر تحقیقی مضامین لکھنے والے یہ کون صاحب ہیں۔یہ خوبرو نوجوان ابھرتے ہوئے مقرر' دانشور' قلمکار اور سیاست داں جناب ایم پی عبدالصمد صمدانی جو علامہ اقبآل کی تخلیقات کو تحقیقی نظر سے پرکھ کر عام لوگوں تک اقبال کا پیغام پہنچایا۔عبدالصمد صمدانی وہ شخصیت تھے جنہوں نے اللہ کی عطا کردہ پرکشش آواز سے اقبال کے اشعار کہہ کر لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔ان کی کوئی بھی تقریر ایسی نہیں تھی جس میں علامہ اقبال کے اشعار نہ ہوں۔اردو سے واقفیت نہ رکھنے والے ملیالیوں کے درمیان اقبال کے اشعار کا مفہوم ملیالم میں بیان کرنے لگے تو عام لوگ اقبال کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتے تھے۔کیرالا کے

مشہور شہر کالی کٹ کے ساحلِ سمندر پر سال میں ایک مرتبہ عبدالصمد صمدانی صاحب مذہبی خطبہ دیا کرتے ہیں ۔ اس جگہ کو علامہ اقبال نگر، کا نام دیا جاتا ہے ۔ جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اُمڈ پڑتے ہیں ۔ اقبال کے شعر سے شروع ہونے والی اپنی تقریر میں علامہ اقبال کے نہ صرف سینکڑوں اشعار کہہ جاتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم بھی بتاتے ہیں اس طرح جناب عبدالصمد صمدانی ہی کی وجہ سے کیرالا کے ملیالی لوگ اقبال کو اور اقبال کے افکار کو جاننے لگے ۔ آج کیرالا کا بچہ بچہ صمدانی صاحب کو جانتا ہے اور جو صمدانی صاحب کو جانتا ہے وہ علامہ اقبال کو بھی جانتا ہے ۔

مارچ ۱۹۹۳ء میں عبدالصمد صمدانی صاحب نے علامہ اقبال کے نام سے ایک کتاب شائع کی ۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی لکھی گئی کتاب ''نقوش اقبال'' کا ترجمہ تھا جو فن ترجمہ کی عظیم مثال ہے ۔ اسے کوٹا کل کے نودھانم ، پبلی کیشنز ، نے شائع کیا ۔ اردو ، فارسی ، عربی ، ملیالم ، انگریزی زبانوں پر یکساں قابلیت اور گرفت رکھنے والے صمدانی صاحب سے بہتر اقبال کے کلام کا ملیالم میں ترجمہ شاید ہی کوئی کرسکتا ہو ۔ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں علی میاں کا پیغام مع دستخط بھی ہے ۔

صمدانی صاحب کے اقبالیاتی تقاریر سے لاتعداد لوگ متاثر ہوئے تھے ۔ ایسے ہی متاثر ایک شخصیت تا ثو اعبدالسلام نے علامہ اقبال کی بانگِ درا سے ۱۱۴ اشعار منتخب کر کے ترجمہ کے ساتھ ۲۰ صفحات کا کتابچہ شائع کیا ۔ کے عبدالغفور کے پیش لفظ کے ساتھ یہ کتابچہ آلپی سے اینی ین ایڈوٹائزر نے شائع کیا ۔ ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ اس کتاب کا نام ''اقبال دھنی گل' صدائے اقبال) ہے ۔

کیرالا میں ہونے والے مذہبی ، ثقافتی ، ادبی ، تعلیمی ، سیاسی وغیرہ مختلف تقاریب اور جلسوں میں جناب عبدالصمد صمدانی صاحب کو مدعو کیا جاتا ہے ۔ جہاں کہیں بھی وہ جاتے ہیں ہر جگہ اقبال کا تعارف کراتے ہیں ۔ اقبال کے ذکر کے بغیر اپنی تقریر ختم نہیں کرتے ۔ فروری ۱۹۹۵ء میں صمدانی صاحب نے علامہ اقبال کے ۱۵ مضامین کا ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیا ۔ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے سرورق پر مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرتے ہوئے علامہ اقبال کی خوبصورت تصویر ہے ۔ اس کتاب میں لا الٰہ الا اللہ ۔ اسلام میں عبادت ، رمضان اور عید ، میلا دالنبی ، نبوت اور تصوف ، خلافت جیسے مضامین کا ترجمہ تھا ۔ ملاپرم ضلع کے کوٹا کل سرہند نگر سے 'نوھانم پبلی کیشنز ، نے علامہ اقبال نڈے لیکھنا نگل ، علامہ اقبال کے مضامین ، کے نام سے اسے شائع کیا ۔ اس کتاب

کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

محبّ اقبال ایم۔ ابو بکر منشی فاضل کے شاگرد ای، احمد جو فی الوقت مرکزی وزیر مملکت ریلوے اور انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہیں۔ انہوں نے اپریل ۱۹۹۴ء میں انڈین مسلم نگلوڈے نوہ دھانا تنڈے کتھا، (ہندوستانی مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کی داستان) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ۲۶۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سرسید احمد خان، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، محمد علی جناح کے حیات اور کارنامے ہیں۔ اسے ترونند پورم سے، مہاس پبلی کیشنز، نے شائع کیا ہے۔ ای احمد صاحب نے علامہ اقبال پر چند ریکا، میں کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔

کیرالا میں اقبالیات کا بڑھتا ہوا رجحان اور علامہ اقبال سے قلبی لگاؤ نے صمدانی صاحب کے دل میں اقبال سے منسوب ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نیک ارادے سے صمدانی صاحب نے شہر کالی کٹ کے شاہراہ پر زمین خرید کر ۹ نومبر ۱۹۹۷ء کو علامہ اقبال انڈین ہیومینٹرین اکیڈیمی قائم کیا جس کا سنگ بنیاد ریاست کیرالا کے مسلم لیگ کے صدر سید محمد علی شہاب تنگل نے اپنے دست مبارک سے رکھا۔ اس اکیڈیمی کے قیام کے بعد علامہ اقبال پر مسلسل سمینار اور مختلف پروگرام انعقاد ہونے لگے۔ جس سے ملیالیوں میں اقبالیات کا رجحان اور بھی بڑھنے لگا۔

اس دوران شکوہ اور جواب شکوہ، کا ایک اور ترجمہ شائع ہوا، پری ویدناوم وچناوم، کے نام سے یہ کتاب احمد مونام کئی نے شائع کیا۔ ۸۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مئی ۱۹۹۸ء میں مل بری پبلی کیشنز، نے شائع کیا۔ یہ ترجمہ خشونت سنگھ کی انگریزی کتاب کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس کا معیار اتنا نہیں ہے جتنا ہونا چاہئے تھا اور فارسی سے ناواقفیت ہی کی وجہ سے کتابوں کا معیار کم ہوا۔ احمد مونام کئی نے فروری ۲۰۰۲ء میں اقبال ہردیتی لیکوا اور وتیر تھا ڈنم، اقبال، قلب کی طرف ایک سفر تیرتھ، لکھا جو پانچ ابواب اور ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایم این وجئین نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا اور وچنم بکس نے اسے پبلش کیا۔

اکتوبر ۲۰۰۲ء میں کالی کٹ کے اسلامک پبلیشنگ ہاؤس نے ۳۵۵ صفحات پر مشتمل، بانگ درا، کا ملیالم ترجمہ، بانگ درا، کے نام سے شائع کیا۔ یہ ترجمہ اصل مفہوم سے دور تھا۔ موپلا شاعر پی ٹی عبدالرحمٰن صاحب نے اسے موپلا گیت کے طرز پر لکھا ہے۔ پی ٹی، عبدالرحمٰن صاحب کا

اردو سے ناواقفیت کی وجہ سے ترجمہ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ مرحوم نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ بانگ درا، کا اردو کلام کا استفادہ کرتے ہوئے پی پی عبدالرحمٰن اور پی اے کریم نے اشعار کا جو مفہوم ملیالم میں پیش کیا وہ پی ٹی عبدالرحمٰن صاحب نے موپلا گیت کے طرز پر لکھا۔ پھر بھی ملیالم میں بانگ درا کا ترجمہ قابل تعریف ہے۔

۲۰ اپریل ۲۰۰۳ء کیرالا کے محبانِ اقبال کے لیے اور اقبالیات کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بے حد خوشی اور مسرت کا دن تھا۔ کالی کٹ میں علامہ اقبال کی عظیم یادگار علامہ اقبال انڈین ہیومینٹرین اکیڈیمی کا افتتاحی تقریب اور اجلاس تھا۔ ۲۰ اپریل ۲۰۰۳ء کو اس عظیم یادگار کا افتتاح کیرالا کے مسلم لیگ کے قائد سید محمد علی شہاب تنگل نے کیا۔ صدارت کی کرسی سجانے کے لیے مشہور صحافی اور ممبر پارلیمنٹ کلدیپ نیر تشریف لائے تھے۔ کلیدی خطبہ ممبر پارلیمنٹ پی۔ ایم سعید نے دیا تھا۔ مہمانوں میں کشمیر سے عنصر شاہ کشمیری صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کے مضامین، کا ملیالم ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ساتھ ہی علامہ اقبال اور ریکھا چترم، علامہ اقبال ایک تحریری نقشہ) ۵۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں علامہ اقبال کی حیات زندگی پر مختصر سا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ نودھانم پبلی کیشنز نے ہی اس کی اشاعت کی ہے۔ اس کتاب کے مصنف عبدالصمد صمدانی صاحب ہی تھے۔

جناب عبدالصمد صمدانی صاحب نے علامہ اقبال بھارتیہ پرتیبھا گلوڈے درشٹی ئیل کے نام سے ایک کتاب مرتب کیا جس کو اگست ۲۰۰۳ء میں اقبال اکیڈیمی نے شائع کیا یہ علامہ اقبال کو تنگ نظری سے دیکھنے والوں کے لیے ایک جوابی کتاب ہے اس میں علامہ اقبال پر لکھے گئے غیر مسلمانوں کے مضامین ہیں اور ماشنکر جوشی، ملک راج آنند، گوپی چند نارنگ، جگناتھ آزاد، راج موہن گاندھی، کلدیپ نیر کے پی ایس مینون، نیتا چے دنیایدی، سکما راژی کوڈ، پیکے گوپی جیسے لوگوں کے مضامین کو اس کتاب میں یکجا کیا گیا ہے جو ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے ایسی ہی ایک اور کتاب 'اقبال درشتلے مانوی گاسندیشم، علامہ اقبال کے فلسفے میں انسانیات کا پیغام کے نام سے اقبال اکیڈیمی نے ستمبر ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ملک راج آنند کا طویل مقالہ The Humanitarian Message in the Philosophy of Iqbal کا ملیالم ترجمہ تھا۔

۴۵صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ترجمہ بھی عبدالصمد صمدانی صاحب نے ہی کیا ہے۔

اپریل ۲۰۰۳ء میں کالی کٹ کے اولیو بکس، نے اقبال پر ایک کتاب، اقبال جیوا اسپر شنگلو ڈے کا دلم کرو دلم (Iqbal Essence and Strenght of Life Touch کے نام سے شائع کیا جو ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مصنفہ ملیالم میں ترجمہ کر کے ڈاکٹر ایم۔ ایس عبدالقادر نے چنگناشیری سے اکتوبر ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔ بانگ درا، بال جبریل، ارمغان حجاز، ضرب کلیم، جاوید نامہ، اسرار خودی وغیرہ مجموعوں سے نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ ۱۷ نظموں پر مشتمل اس کتاب کے کل صفحات ۷۰ ہیں۔ چنگناشیری کے فلاحیہ اسلامک سینٹر، نے اس کتاب کی اشاعت کی ہے۔

ضلع کاسرگوڈ سے کے پی۔ کے احمد بن عبداللہ صاحب نے شکوہ جواب شکوہ، کا پرادی یوم پردی گرانوم، کے نام سے ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب، رحمانیہ بک اسٹال، کمبلا نے جولائی ۲۰۰۷ء میں شائع کی۔

کنور کے سمائم پبلی کیشنز، نے اپریل ۲۰۰۸ء میں نکشتر نگل کو اپرم کرے لوگانگل، (ستاروں سے آگے جہاں اور بھی) کے نام سے علامہ اقبال کے مختلف نظموں کا مجموعہ شائع کیا۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے نظموں ملیالم ترجمہ سی۔ ٹی بشیر صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب کے لیے پیش لفظ جسٹس (ریٹائرڈ) وی، خالد صاحب نے لکھا ہے۔ یہ کتاب ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

کالی کٹ کی اقبال اکیڈیمی میں وقتاً فوقتاً اقبال پر جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے علمی پروگراموں سے عام ملیالی لوگ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی تقریبات میں اقبال پر کسی نہ کسی کتاب کی رسم اجرا ہوتے رہتی ہے۔ ایسے ہی پروگرام میں جاوید اقبال کی مرتب کردہ Stray Reflection علامہ اقبال کا نجی نوٹ بک کا عبدالصمد صمدانی نے علامہ اقبال نڈے نوٹ بک کے نام سے ملیالم میں ترجمہ کر کے شائع کیا اس کتاب کی رسم اجراء ملیالم کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ایم ٹی واسودیون نائر نے کیا۔ اس موقع پر ایم ٹی واسودیون نائر نے علامہ اقبال کے افکار کو ملیالم میں منتقل کرنے پر عبدالصمد صمدانی صاحب کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ اقبال پر جو کام کیرالا میں اقبال اکیڈیمی کر رہی ہے۔ وہ قابل فخر ہے۔ ایک دانشور مفکر اور

دردمند انسان کی حیثیت سے علامہ اقبال نے برصغیر پر اپنے کردار اور ادب کے ذریعہ انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ علامہ اقبال نوٹ بک کے نام سے ملیالم میں جن افکار کو منتقل کیا گیا ہے وہ یہاں ذہن سازی میں مددگار ثابت ہوں گے۔ ۳۷۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اقبال اکیڈیمی نے اپریل ۲۰۰۸ء میں اشاعت کیے اس کتاب کا پیش لفظ ایم، تی واسودیون نائر نے ہی لکھا ہے۔

نومبر ۲۰۰۸ء میں اقبال اکیڈیمی نے ترانہ ہندی، کا ملیالم ترجمہ اور شرح وتفہیم کے ساتھ، بھارتیہ گیتم کے نام سے شائع کیا۔ ۶۲ صفحات کے اس کتاب کے خالق عبدالصمد صمدانی صاحب ہی تھے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ملیالم کے جانے مانے ادیب اور قلمکار کمار اڑی کوڈ نے لکھا ہے۔ اس کتاب کی رسم اجرائی انجام دیتے ہوئے دکن پارلیمنٹ ویریندر کمار نے کہا کہ علامہ اقبال ہندوستانی تہذیب، تمدن، ثقافت کے امین ومحافظ ہیں۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کے ذریعہ اس شاعر مشرق کے وطن عزیز سے محبت کا انمٹ نقوش چھوڑا ہے۔ اس گیت کے ذریعہ انہوں نے آنے والی نسلوں کو حب الوطنی کا درس دیا ہے۔ علامہ اقبال انڈین ہیومینٹرین اکیڈیمی کے ذریعہ جناب صمدانی صاحب کے مطالعہ وریسرچ کی شروعات سے اس اکیڈیمی کے ذریعہ کئی تشنگان علم اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔

علامہ اقبال اکیڈیمی میں آر ایل، بھاٹیہ (گورنر) کپل سبل، کرن سنگھ، جسٹس عبدالغفور، کلدیپ نیر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، حمید اللہ بھٹ، عظمیٰ ناہید جیسے قابل قدر اور اہم شخصیات نے بھی اقبال پر خطبات پیش کیے ہیں۔

علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ، کا اور ایک ترجمہ کالی کٹ سے AIME پبلی کیشنز نے اگست ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔ پری بھوم پرتی اترم کے نام سے عبدالصمد رحمانی نے اسے ملیالم میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تفہیم وشرح بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی اشعار اردو رسم الخط میں بھی شائع کیے ہیں۔ ۲۱۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ تلاشیری کے پروفیسر اے۔ پی۔ زبیر صاحب نے لکھا ہے۔

ضلع ملاپرم کے کل پکنچیری سے شائع ہونے والا ماہنامہ دھیشنا، نے نومبر ۲۰۱۰ء میں علامہ اقبال پر خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔ دھیشنا، کے مدیر چیریا منڈم عبدالرزاق کے طویل مضمون کے

علاوہ کے ٹی ۔ رادھا کرشنن کوڈالی ،ذاکر حسین جیسے لوگوں کے مضامین اور اقبال کے نظموں کے تراجم بھی ہیں ۔

ملیالم میں مختلف رسالے جریدے اور روزناموں میں علامہ اقبال پر مضامین لکھنے والوں میں سید محمد سرور، کے محمد عبدالکریم ، کے پی ، کنہی موسیٰ ، احمد کٹی کلاتل ، پارئیل شمس الدین جیسے کئی شخصیات ہیں ۔عبدالصمد صمدانی صاحب جن کو اقبال سے والہانہ لگاؤ، اقبال کی یاد میں عظیم عمارت تعمیر کرنے پر مجبور کر دیا۔ کیرالا میں جب بھی اہم شخصیات تشریف لاتی ہیں تو اکثر ان کی تقاریر کے ترجمے کی ذمہ داری صمدانی صاحب پر ہی ہوتی ہے ۔ایک مرتبہ انتخابی جلسہ عام سے خطاب کرنے کے لیے ہندوستان کے وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ ۲۰ اپریل ۲۰۰۶ء کالی کٹ تشریف لائے ان کی انگریزی تقریر کا ترجمہ صمدانی صاحب کو ہی کرنا تھا۔ منموہن سنگھ اپنی تقریر میں علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیے۔

یونان ومصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا

ماہر اقبالیات جناب عبدالصمد صمدانی نے اس شعر کا مفہوم بہت ہی سادہ اور دلچسپ انداز میں اس طرح سے پیش کیا کہ جلسے میں موجود عوام جھوم اٹھے ۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ کی زبان سے علامہ اقبال کے یہ شعر سن کر صمدانی صاحب جوش وولولے کے ساتھ آگے کے اشعار بھی کہہ ڈالے ۔

یونان ومصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمنِ دور زماں ہمارا

ملیالم میں ان اشعار کا مفہوم تفصیل سے واضح کیا تو تعریفوں کا تانتا بننا شروع ہوگیا۔

ملیالم میں اقبالیات کے اور بھی پہلو اجاگر ہونا باقی ہیں ۔ اس مقالے میں ملیالم میں اقبالیات کا سرسری طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔اس موضوع پر اور بھی عرق ریزی سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے ۔ ملیالم کے روزنامہ چندریکا اور ہفت روزہ ، چندریکا ، کا اقبالیات

تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ ملیالم کے روزنامہ چندریکا اور ہفت روزہ، چندریکا، کا اقبالیات کے فروغ کے سلسلے میں تحقیق کیا جائے تو وہ بھی ایک طویل مقالہ بن سکتا ہے۔ کیرالا میں دوسری ریاستوں کی بہ نسبت اردو کا ماحول کم ہے اس لیے کیرالہ میں ہونے والی اردو کی ترقی، اقبالیات کا فروغ ان سب باتوں سے دوسری ریاستیں بہت کم واقف ہیں۔ حیدرآباد اقبال اکیڈیمی نے اس طرح کا سمینار منعقد کر کے کیرالا میں اقبالیات کے خدمات کو ہندوستان بھر میں معلوم کرانے کا موقع دیا۔ اس لیے ہم تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

K.P Shamsuddin
Urdu Teacher
A.M. High School
P.O/Tirurkad
Malappuram (DT)
Kerala , India679351

☆☆☆☆☆

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل چھل کر بیکراں ہوجا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا
ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
اقبالؔ

☆☆☆

علیم صبا نویدی (مدراس)

علامہ اقبالؔ کی شہرہ آفاق نظموں ''شکوہ'' اور جواب شکوہ کی تشریحات بزبان ٹمل

ایک زبان سے دوسری زبان میں ادب پاروں کے تراجم یا تشریحات کا رواج عام رہا ہے جس زبان کا ادب پارہ ہو اسکی تشریح اسی زبان میں اصل متن کو مجروح نہیں کرتی ۔ غالب کی شرحیں اردو میں بہت کامیابی سے ہو پائی ہیں ۔ شیکسپئر کے ادب پارے انگریزی میں جب زیر بحث آتے ہیں تو شیکسپئر کی اصل تخلیقات کو کوئی زک نہیں پہنچتا ۔ مگر غالبؔ کا ترجمہ کسی اور زبان میں ہو تو غالبؔ کی وہ عظمت اجاگر نہیں ہوگی جو ان کی تخلیقات میں ہے ۔ یہ بات سب کی سمجھ میں بہ آسانی آتی ہے اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں ۔ مگر ایک بات مسلم ہے کہ غیر زبان دان کے آگے کسی زبان کی کوئی تخلیق آتی ہے تو وہ اپنی زبان کی مسلمات کو ذہن میں رکھ کر انہیں سمجھنے کی کوشش کرے گا اور ایک زبان کی لفظیات اس زبان کے موضوعات کو جس طرح ادا کرسکتی ہیں وہ دیگر زبان کی لفظیات ادا کرنہیں سکتیں ۔ زبان میں محاورات ، اشارے کنائے ، صرف ونحو کی پیچیدگیاں ، فصاحت و بلاغت پیدا کرنے والے عناصر وغیرہ اس زبان سے مختص ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک شاعر کا ایک عام فہم اور سہل ترین شعر بھی اپنی زبان کا مزاج قائم رکھ کر ایک نہ ایک خوبی پیدا کرتا ہے ۔ وہ اظہاری خوبی ہوسکتی ہے جو اس شعر کو اونچا اٹھاتی ہے ۔ یا تراکیب لفظی ، قوافی وردیف ، مفہوم بین السطور وغیرہ ایسی باتوں سے ہر زبان کام لیتی ہے ۔ اگر ترولور کی دوسطری نظموں (کرلوں) دوسری زبان میں ترجمہ کریں گے تو ''کرلوں'' میں جو خصوصیت ہے وہ دیگر زبانوں میں مفقود ہوگی ۔ اسی طرح اقبال کے ''شکوہ'' اور جواب شکوہ'' کو اردو سے ٹمل میں منظوم کریں تو ہرگز اقبال کا طرز گفتار بحال نہیں رہے گا ۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر ٹاملناڈو کے

دو اشخاص نے اقبال کی شہرۂ آفاق نظموں ''شکوہ'' اور جواب شکوہ'' کی ماہیت سے ٹمل زبان بولنے سمجھنے والوں اور ادیبوں اور شاعروں کو واقف کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ان میں سے ایک ہیں جمال محمد کالج ترچی کے پروفیسر سید ابراہیم اور دوسرے ایک غیر معروف صاحب جن کا صرف نام لیا گیا ہے مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ان کا نام ترچی رسول بتایا جاتا ہے۔وہ ٹمل زبان میں ''مردملرچی'' Maru Mularchi نشاۃ ثانیہ نامی اخبار کے مدید تھے جو ترچی سے شائع ہوتا تھا۔اول الذکر موصوف تخلیقات اقبال کا پورا احاطہ کرنے کی تمنا رکھتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اس عظیم شخصیت کی لازوال تخلیقات کو ٹمل والوں میں مانوس کریں اور انہیں ٹمل دنیا میں زندہ جاوید بنادیں۔انہوں نے اپنے پیش لفظ میں بتایا ہے کہ اقبال کی یہ دو نظمیں وقتاً فوقتاً ٹمل زبان میں ترجمہ ہوکر منظر عام پر آئی ہیں۔مگر انہیں شائع کرنے والوں کو پوری طرح کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔نیز بتایا کہ یہ نہیں معلوم کہ ماضی قریب میں کسی اور نے یہ جرأت کی ہے کہ نہیں۔پھر اپنی کوشش سے متعلق یہ صفائی دی ہے کہ زمانہ کے حالات کے پیش نظر ان نظموں کی اصل متن کے ساتھ پوری تشریح کی جائے اور موجودہ لوگوں کے آگے اقبال کے مقصد کو اجاگر کیا جائے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ اقدام کیا ہے۔آخر میں انہوں نے جو بات اپنے پیش لفظ میں کہی ہے اس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

''کسی کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے سے اس کی خوبی بحال نہیں رکھی جاسکتی مگر کوشش یہی ہوتی ہے کہ حتی الامکان تخلیق کار کے اہم مقصد کو زک نہ پہنچا کر اس کو قریب قریب صحیح طور پر اجاگر کیا جائے اور جس زبان میں وہ ترجمہ ہوتی ہے اس زبان کی خوبیوں میں اصل متن کی خوبیوں کو سمونا ہی صحیح ترجمانی ہوگی اور یہ وطیرہ ہر زبان کے ماہرین کا ہے اور سبھوں نے اس پر اتفاق جتایا ہے۔اس خیال کو ذہن میں رکھ کر سہل ٹمل زبان میں ہر ایک کی سمجھ میں آنے والے انداز میں اقبال کی ان نظموں کی تشریح کی گئی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی عظمت اور شان کو ٹمل میں ہو بہو پیش کرنا ناممکن ہے۔اس لیے اردو متن کو ہو بہو اردو رسم الخط میں پیش کر کے اس کا تلفظ تمل زبان میں جوں کا توں کرنے کی پہلی کوشش ہے پھر ٹمل میں اس کا موضوع و مفہوم پیش کیا گیا ہے''۔

موصوف شارح نے اقبال کی مختصر سوانح حیات پیش کی ہے۔ علامہ مرحوم کی پیدائش، حسب نسب، تعلیم، سیاسی خدمات، شاعری، فلسفیانہ طرز فکر وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔

پھر ''شکوہ'' کا آغاز کیا ہے ایک ایک بند اردو رسم الخط میں پیش کرتے گئے ہیں۔ ہر بند کو مکمل رسم الخط میں تقریباً اردو تلفظ کے قریب کرتے ہوئے پیش کیا ہے اور اس کے بعد ہر شعر کا قریب قریب ترجمہ پیش کیا ہے۔ ہر بند کے تینوں شعروں کے ترجمہ کے بعد موصوف نے اس پورے بند کی جامع تشریح بہ عنوان ''شرح'' لکھی ہے۔ یہ التزام ''شکوہ'' اور جواب ''شکوہ'' میں برابر جاری رکھا ہے۔

موصوف کا طریقۂ کار اس طرح ہے

ا۔ شکوہ

ا۔ کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محوِ غم دوش رہوں

۲۔ نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

۳۔ جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اس کے نیچے مکمل زبان کے رسم الخط میں اردو متن کو ہو بہو پیش کیا ہے

پھر اس کے بعد ترجمہ شعر بہ شعر ہوا ہے۔

ا۔ میں ایسا کیوں رہوں جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے۔
روبرو آنے والے فائدے کے حصول کی کوشش میں بھول جانے والے کی طرح کیوں رہوں؟
آنے والے دور کے بارے میں غور نہ کر کے، ماضی کے غموں میں کیوں کھویا رہوں۔

۲۔ بلبل نامی پرندے کے نالوں کو سنوں اور پوری طرح خاموشی اختیار کروں
اے عزیز دوست! کیا میں گلاب کا کوئی پھول ہوں؟

۳۔ میری قوت گویائی مجھ میں ہمت پیدا کرنے والی ہے!

اللہ کے آگے شکوہ کرنے کی حد تک مجھ میں جرأت پیدا ہوگئی ہے

شاعر نے کس ڈھنگ سے ہر شعر کی ترجمانی کی ہے یہ قابل غور ہے۔اس میں اصل موضوع کے بیان میں اقبال نے جو تراکیب لفظی استعمال کی ہیں اس کا ٹمل زبان میں ہو بہو ترجمہ ناممکن ہے۔زیاں کار بنوں'' سود فراموش رہوں، فکر فراد، محو غم دوش، ہمنوا، جرأت آموز، تابِ سخن ، خاکم بدھن ایسی لفظیات ہیں جن کی خوبی ٹامل میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔اقبال کا یہ اظہار خود اردو والوں کو اچھنبے میں ڈالنے والا ہے اردو والے ہی جب اس کی ترجمانی نہیں کر پاتے ہیں تو یہ زبانِ ٹمل میں کہاں سے ادا ہو پائیں گے۔ٹمل ہی کیوں، دنیا کی کسی زبان میں بھی اس خوبی کو ہو بہو منتقل نہیں کیا جاسکتا۔

پھر اس ترجمہ کے بعد ''تشریح'' کے عنوان سے موصوف نے جو باتیں کہی ہیں یہیں وہ اپنی زبان میں روح اقبال اور فکر اقبال کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں جو ترجمے سے قدرے مستحسن ہے۔پہلے بند کی تشریح بھی ٹھیٹ اردو ترجمہ میں ہے جو ٹمل کے متن میں ادا ہوا ہے۔

اسلام اللہ کی جانب سے عطا کردہ مذہب ہے، مسلمان نوع انسان میں فوقیت عطا کردہ جمعیت ہیں۔یہ قرآن کا بیان کردہ خیال ہے۔

اس طرح کے بہترین مذہب میں پیدا ہونے ہم لوگ کیوں سب کچھ کھوئے ہوئے اور نقصان اٹھائے ہوئے افراد کی طرح رہیں اور آئے ہوئے غموں کا رونا روئیں اور کوشش کر کے حاصل ہونے والے فوائد سے سودمند نہ ہوں؟

کیوں آنے والی عسرتوں سے بے نیاز زندگی کو کسی طرح حاصل کرنے کی طرف دھیان نہ دیکر عہد ماضی کے واقعات ہی میں کھو کر غم گین رہیں۔

مسرت وانبساط میں گاتے پھرنے والے پرندے جب شاموں میں اپنے مستقر پر لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کے آشیاں اجڑ گئے ہیں تو وہ فرطِ غم میں نالہ کرتے ہیں تو ان کے غموں میں ڈوبی ہوئی آواز کو سنی ان سنی کرنے والے ہم کیا کوئی گلاب ہیں جو اپنی جگہ پر مست ہے؟

شاعر کہتا ہے کہ آواز گفتگو (تحریر) ان میں جرأت پیدا کرتی ہے۔اللہ کے دربار میں بھرم کے ساتھ انصاف طلب کرنے کی حد تک ہم میں جرأت پیدا ہوگئی ہے۔

شاعر نے اس میں خود کو متکلم بنایا ہے۔ ''میں'' ''مری'' اور ''مجھ کو'' اقبال ہی کی نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کی نمائندگی کرنے والی ضمیریں ہیں۔ سماج کی جانب سے سماج کے لئے وہ اللہ کے ہاں شکوہ کر رہے ہیں''۔ کہنے کی بجائے وہ اللہ سے استدعا کر رہے ہیں''۔ کہنا ہی بجا ہے۔

یہاں موصوف مترجم نے ''بلبل'' کی تعریف میں بھی متن و ترجمہ کی ذیل میں ایک نوٹ دیا ہے جو قابلِ غور ہے۔ بلبل ایک پرندہ ہے جو ادب پاروں میں آتا ہے۔ وہ دن بھر بڑے سریلے انداز میں گاتا پھرتا ہے۔ راتوں میں بندر اس کا گھونسلہ جب برباد کر دیتے ہیں تو وہ غم سے نڈھال ہو کر فریاد کرنے لگتا ہے۔

مذکورۂ بالا ڈھنگ سے ہی شکوہ اور جواب شکوہ کی تفہیم و تشریح سے کام لیا ہے۔ موصوف کا ڈھنگ کئی اعتبار سے سراہنی ہے۔ ٹمل زبان میں اردو کی لطافت، شائستگی، تہذیب اور سادگی کو سمونا بالکل محال ہے۔ اقبال جیسے عظیم شاعر کو تقریباً دنیا کی تمام عظیم زبانوں میں پیش کرنے کی سعادت لوگوں کو نصیب ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادب کو عالمی ادب کے ہم پلہ کرنے میں ہمارے عظیم اکابرین نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ انھیں ہم بھول بیٹھے ہیں۔ اور اردو کی کس مپرسی کا رونا رو رہے ہیں۔ ٹمل زبان کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہر زبان کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے اسے دوسری زبان کے معیار پر تولا نہیں جا سکتا۔ اردو کی عظمت کو ٹمل والوں کے روبرو پیش کرنے کے اس رجحان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ترچی ہی کے ایک اور بزرگ ادیب (جن کو ٹمل زبان پر پورا عبور ہے اور جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی پروفیسر سید ابراہیم) نے انہی دو نظموں ''شکوہ'' اور جواب شکوہ کو لیکر اقبالؒ کے اظہار و اسلوب کو نمایاں کیا ہے۔ ترچی رسول صاحب نے اردو متن کو پیش کرتے ہوئے ترجمہ اور تشریح کی تھی مگر سید ابراہیم صاحب نے اردو متن کو پیش نہیں کیا اور صرف ترجمہ کرتے چلے گئے ہیں اور بعض جگہ فٹ نوٹ کے ذریعہ چند لفظیات کی تفہیم کی ہے۔ کہیں کہیں کسی بند کی تشریح کو لازم سمجھ کر اس کو اہمیت دی ہے۔ ان کے ترجمہ، فٹ نوٹ، اور تشریح کو سمجھنے کے لیے شکوہ کا آٹھواں بند لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ موصوف کا رویہ کیسا ہے۔

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اب سید ابراہیم صاحب کے کئے ہوئے ترجمہ پر پہلے غور کرتے ہیں۔

۱۔ تیرے لئے جب ہم مقدس جنگ (جہاد) پر کمر بند ہوئے تو اس سے پیٹھ پھرایا ہی نہیں!
۲۔ شیروں جیسے بڑے بڑے بہادروں کو بھی ہم نے نیچا دکھا کر بھاگنے پر مجبور کیا تھا!
۳۔ تیرے دکھائے ہوئے صراطِ مستقیم سے ہٹنے والوں کو دیکھ کر ہم صبر کرنے والے تو نہیں تھے
۴۔ تلوار کیا چیز ہے؟ توپوں۲، کے روبرو بھی کھڑے ہو کر ہم نے جہاد کیا تھا کہ نہیں؟
۵۔ ہر ایک کے دل میں توحید کا نقش ثبت کیا تھا!
۶۔ ذرا بھی پس وپیش نہ کرتے ہو تلواروں کے سایہ میں بھی اس کا (یعنی توحید کا) پیغام عام کیا تھا۳۔ یہ انداز تقریباً ہر بند میں جاری وساری ہے۔ آزاد ترجمہ سے مفہوم تو اجاگر ہوتا ہے مگر جو خوبی اقبال کی شعریت میں ہے اس کو کسی طرح بھی اجاگر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے تراجم میں بھی کوئی ایسی بات اپنائی نہیں گئی جس کے ذریعہ اقبال کی لفظی تراکیب کی طرف ٹمل والوں کا دھیان پھیرا جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ان بزرگوں نے صرف موضوع کی طرف دھیان دیا ہے۔ اقبال کے اظہار واسلوب کو وہ چھو نہیں پائے ہیں۔ اردو سے ناواقف شخص کے لئے اس کو بعینہ بیان کرنا بعید از امکان بات ہے۔ معلوم نہیں مترجمین نے براہ راست اردو ہی سے ترجمہ کیا ہے یا کسی انگریزی ترجمے کا ترجمہ کیا ہے۔ کچھ بھی ہو ان تراجم کو انہوں نے جیسا پیش کیا ہے انھیں بغیر چوں وچرا کئے ہم قبول کر ہی لیں اور ضرور اس بات کی داد دیں کہ روحِ اقبال کو پانے کا احساس جو دلاتے ہیں وہ ایک بہت عظیم مقصد ہے اور اس مقصد میں یہ دونوں مترجمین کامیاب ہیں۔

حواشی

۱۔موتہ کی جنگ میں ایک لاکھ رومی سپاہیوں کے مقابلہ میں تین ہزار مسلمانوں نے حصہ لے کر انہیں شکست دی تھی۔

۲۔ عثمانی ترکوں نے اپنے مخالفین سے جب جنگ کی تھی تو میدان جنگ سے مخالفین کے توپوں کو اپنے قبضہ میں لایا تو مخالفین پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔چھینی ہوئی توپوں کو پھر حاصل کرنے کی جرأت نہیں کی گئی۔دنیا کی تاریخ میں ترکوں نے ہی اس طرح کی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

۳۔حضور پرنور ﷺ کے اصحابِ کرامؓ اسلامی تبلیغ کے موقعوں پر جس طرح سے اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے رہتے تھے اس کی گواہی تاریخ دیتی ہے۔

☆☆☆

گرم ہوجاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چارسُو و رنگ و بُو
پاک ہوتا ہے ظن وتخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پُرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تارِ رفو

اقبالؔ

☆☆☆

ڈاکٹر جہاں آرا بیگم

پروفیسر شعبۂ اردو

کرناٹکا اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی میسور

کلام اقبال کا قرآنی اسلوب

دور جدید میں چند شخصیات ایسی گذری ہیں جن پر مستقل اور مسلسل تحقیقات وتصنیفات منظر عام پر آتی رہی ہیں، ان میں ایک نامی ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ہے۔ اقبال اور اقبالیات شعر وسخن کے قلم کاروں کے علاوہ ناقدین ومبصرین کا بھی دلچسپ موضوع رہا ہے، مختلف میدانوں کے ماہرین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ کلام اقبال کا ایک اہم موضوع یہ بھی رہا ہے کہ اس کا اسلوب کیا ہے؟ علامہ نے کون سے مراجع زیادہ استعمال کئے ہیں، انہوں نے کون کون سے مفکرین، فلاسفر، شعراء وادباء علماء وصوفیاء سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے کلام کے موضوعات کیا کیا ہیں، غرض متنوعات کی قبیل میں علامہ کا کلام تحقیقی وتالیفی میدان میں صف اول میں نظر آتا ہے۔

اقبال کے کلام مراجع میں جہاں مختلف آراء ہیں وہیں بہت سارے مفکرین وماہرین اقبالیات کا فیصلہ ہے کہ ان کے افکار اور تخیلقات اور کلام کا سب سے بڑا مرجع اور ماخذ قرآن کریم ہے۔ اس کا اظہار متعدد مقامات پر خود انہوں نے کیا ہے جس کو قرآن کا ہر طالب علم بآسانی سمجھ سکتا ہے چنانچہ آپ نعت رسول کہتے ہوئے بارگاہ سرور کونین ﷺ میں عرض کرتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
خشک گرداں بادہ در انگورِ من زہر ریز اندر مئے کا فورِ من
روز محشر خوار رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

یعنی اے آقا اگر میرا آئینہ دل بے جوہر ہے، قلب وزبان پر قرآن کے علاوہ کچھ اور ہے تو روز قیامت آپ مجھے اپنی شفاعت وزیارت سے محروم کردیں۔ علامہ کے اس اظہار کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شخصیت کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام کا جو پرتو تھا وہ قرآن مجید کا تھا۔ مفکر

اسلام سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رقم طراز ہیں کہ:

جب آپ اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اقبال کا کلام ہمارے جانے پہچانے شعراء سے بہت مختلف ہے۔ اقبال کا کلام ہمارے شعور واحساس، قلب وجدان اور اعصاب میں حرکت وحرارت، سوز وگداز، درد وتپش پیدا کرتا ہے۔ اور پھر شعلہ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں۔ فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہو جاتے ہیں، جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقتور ایمان، پرسوز سینہ اور بے چین روح رکھتا ہے۔''

علامہ کی شخصیت کو بنانے والا عنصر وہ ہے جو آج ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہے، مگر افسوس کہ آج مسلمان اس کی روشنی سے محروم اس کے علم وحکمت سے بے بہرہ ہیں۔ میری مراد اس سے قرآن مجید ہے۔ اقبال کی زندگی پر یہ عظیم کتاب جس قدر اثر انداز ہوئی ہے کہ اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی نے ان پر اثر ڈالا ہے۔ اقبال کا ایمان چونکہ ''نومسلم'' کا سا ہے خاندانی وراثت کے طور پر انہیں نہیں ملا ہے اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن میں شغف، تعلق اور شعور واحساس کے ساتھ مطالعہ کا ذوق زیادہ ہے۔ خود آپ اپنے قرآن کے مطالعہ کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ان کا معمول تھا کہ روزانہ نماز فجر کے بعد وہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے، والد جب بھی دیکھتے تو پوچھتے کہ اقبال کیا کر رہے ہو، اقبال جواب دیتے کہ قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا آخر ایک دن اقبال نے پوچھا ابا جان! آپ روزانہ مجھ سے یہی پوچھتے ہیں اور جواب دینے پر خاموش چلے جاتے ہیں۔ والد نے جواب دیا کہ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھو جیسا کہ اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے۔

اس کے بعد علامہ نے اسی مصداق سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا، علامہ نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور وفکر اور تدبر وتفکر کرتے ہوئے گذار دی قرآن پڑھتے، قرآن سوچتے قرآن بولتے، اس کا اظہار بعد میں آپ نے یوں کیا:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

یہ قرآن مجید ہی کا انعکاس تھا کہ جس نے اقبال کو عرفان نفس، خودی کے سرنہاں، تعمیر ذات وصفات کو حقیقی منت کش خودی تک پہونچایا جس کا اظہار آپ یوں کرتے ہیں کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب وشوق — تن کی دنیا، تن کی دنیا سود و سودا مکر وفن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج — من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

قرآن کے بعد آپ کی شخصیت پر جو اثرات تھے وہ بھی قرآن کا ہی پرتو تھے مثلاً احادیث وروایات جو کہ قرآن کے ہی مطابق

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (سورہ نجم)

اور نبی اپنی خواہشات سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ وہ بھی وحی الٰہی کی روشنی میں ہوتی ہے

آپ نے میر حسن سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس میں گلستان سعدی اور دیگر صوفیاء کرام کے کلام تھے اور یہ سب قرآنی احکامات اور بہت ساری احادیث وروایات کے متن وماحصل پر مشتمل ہیں اور عربی زبان تو اب اکثر و بیشتر قرآن واحادیث سے ہی ماخوذ ہے۔ اس طرح کی بنیاد سے آپ کی تعلیم وتربیت پروان چڑھتی ہے پھر جب آپ لاہور میں انجمن حمایت اسلام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہاں کے اجلاس میں باقاعدہ شرکت ہوتی ہے تو وہاں کے اکابر علماء ودانشوران سے استفادہ وافادہ عام ہوتا ہے پھر آگے بڑھ کر علامہ نے جب مولانا جلال الدین رومیؒ کا دامن تھاما تو تاحیات انہیں کے ہو کے رہ گئے۔ مثنوی مولانا روم تو علم وعرفاں کا ایک عظیم بے بہا دفتر ہے اور حکمت ودرایت کا بحر زخار ہے۔ جسے اہل علم نے قرآنی تعلیمات کا عجمی نسخہ بنایا ہے۔

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآن در زبان پہلوی

اسی طرح احادیث رسولؐ، اقوال صحابہؓ ہوں یا صوفیاء، مثنوی مولانا روم ہو بات گھوم پھر

کر قرآن اور اس کی تفسیر وتشریح تک ہی جاتی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال آخری ایام میں قرآن کی تلاوت کرتے وقت اتنا روتے تھے کہ اوراق تر ہو جاتے۔ جنہیں ان کا ملازم علی بخش روزانہ سکھاتا تھا۔ علامہ کے نزدیک قرآن رٹنے سے زیادہ غور وفکر پر ابھارنے اور اس کے عمل کا درس دینے والی کتاب ہے۔ آپ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مقدمہ کی ابتداء میں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی رہی ہے لیکن جب ہم علم کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفہ یونان کے زیر اثر ہوا، اور ان کا مقابلہ قرآن پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ یونانی فلسفہ نے مفکرین اسلام کے مطمح نظر میں اگرچہ بہت کچھ وسعت پیدا کر دی تھی مگر مجموعی قرآن میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔ سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی۔ اس کے نزدیک انسان کا مطالعہ کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے نہ کہ نباتات وحشرات یا ستاروں کی دنیا مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر بھی وحی الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے اس امر کی بار بار دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر وتبدل کا مشاہدہ کیا جائے۔ نیز دن اور رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضاء لامحدود میں تیرتے پھرتے۔ گردش شمس وقمر وکائنات کے اسرار تلاشے جائیں گویا:

حقیقت ایک ہے ہر شئی کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

(بحوالہ: تشکیل جدید الٰہیات اسلام ص ۵۱۴)

اقبال قرآن کو نسل انسانی کی ہدایت کامل واکمل اور منفرد واحد نسخہ اور ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں اور اسے دراصل خدا کا نازل کردہ انسان اور انسان وفطرت کے مابین قائم قوانین وضوابط کا لاثانی مجموعہ ہے وہ کہتے ہیں کہ:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی قرآن بھی ترا مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا مرا

یہ کلام الٰہی کا ہی فیضان تھا کہ آپ کا کلام بسا اوقات تفسیر قرآن معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ہم

آپ کی نظم کفر و اسلام میں دیکھتے ہیں جہاں آپ نے تقابلی انداز میں جو بات کہی ہے ان کو سمجھنے کے لئے تفاسیر قرآن کھنگالنی پڑے گی آپ کہتے ہیں کہ

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا قرینہ تجھ میں خلیل کا　　میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آزری
میرا عیش غم، مرا شہد سم، میری بود ہم نفس عدم　　ترا دل حرم گرو عجم ترا دیں خریدہ کافری
دم زندگی، غم زندگی، رم زندگی، سم زندگی　　غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

اس میں اولین شعر کو ہی سمجھنا ہو تو قصہ موسیٰ و فرعون نیز ابراہیم و آزر تک کے تازیانے ملانے ہوں گے اور یہ کام اسی کے نوک زبان و قلم کر سکیں گے جو سرتاپا انعکاس کلام الٰہی ہو، علامہ ان ہی میں سے تھے۔

آپ فرماتے ہیں:

قرآن مجید کا مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر گونا گوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔ قرآنی تعلیمات کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیش نظر گوئٹے نے بہ اعتبار ایک تعلیمی قوت، اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن سے کہا تھا کہ تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں۔ ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

علامہ اقبال ان نامور مفکرین کی صف اول میں نظر آتے ہیں جو قرآن کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اور اعلانیہ مغربی تہذیب کی چکا چوند سے عالم اسلام کو مرعوب نہ ہونے کا مسلسل درس دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مغرب کی ملمع سازیاں اور اس کا ناچ گانا، اس کے راگ و رنگ کے کھیل اس کی طاقت اور اس کے پھیلنے کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ ان کی طاقت ان کی تحقیق و جستجو ہے جس کو انہوں نے بڑی مہارت سے مسلمانوں سے حاصل کیا اور اب بڑی چابکدستی سے اس کو لہو و لعب کے پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ استشراق (Orientalism) کی بنیاد ڈال کر ایک طرف علم کے خزانوں کو ہم سے حاصل کیا تو دوسری طرف یہ تحریک بھی چلائی کہ کس طرح ان کو سہل پسند بنا کر غور و فکر سے دور کر دیا جائے آپ زوالِ اندلس کی تاریخ پڑھیں تو یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ کس طرح ان کی سازش کامیاب ہوئی۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اس درد کو اقبال اپنی قوم تک منتقل کرتے ہوئے خوب نظر آتے ہیں ایک امید کے ساتھ کہ

نہیں نو امید اقبال اس کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

علامہ قرآن کو ہمیشہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ دیکھتے ہیں اور قرآنی تنبیہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے جیسا کہ اللہ نے فرمایا

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا (سورہ محمد)

کیا وہ قرآن پر گہری سوچ و فکر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں

اس کو علامہ یوں فرماتے ہیں:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطر قرآن کو چلپا کر دیا تو نے
ہر کوئی مست ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے ، نہ دولت عثمانی ہے تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین

علامہ اقبال کے نزدیک امت مسلمہ کی قرآن سے دوری کا سبب نظام تعلیم ہے جس نے اس کے توازن کو غلط اور مزاج کو فاسد کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے شعاع شمسی کو گرفتار کرنے والا اپنا مقدر نہ چمکا سکا، نظام سیارگان کو جاننے والا کسی راہ عمل کو نہ پہونچ سکا اور سائنس کا محقق اپنے نفع وضرر کو بھی نہ سمجھ سکا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر نہ کرسکا
اپنی حکمت کے خم وپیچ میں الجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا

علامہ اقبال کے نزدیک علم تو یہ ہے جس کو اللہ نے قرآن میں عنایت فرمایا ہے اور وہ علم اور دین دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولین وحی میں ارشاد فرمایا:

اقرأ باسم ربك الذی خلق ، خلق الانسان من علق ، اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم ، علم الانسان مالم یعلم ۔

اس مزاج اور تصور کو واضح کرتے ہوئے مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

اس دین کا مزاج ہی علم ہے۔ اس لئے اس میں سب سے پہلے جو دعوت دی گئی ہے کہ ''پڑھو'' تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتا ہے پہلی بات کہ فکر انگیز دعوت اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ پڑھو اپنے رب کے نام سے، اس کی رہنمائی میں راستہ طئے کرو، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل ہے۔ بہت پر پیچ ہے، پر خطر ہے، قدم قدم پر رہزن ہیں۔ بڑے بڑے سمندر ہیں، سانپ وبچھو ہیں، اس لئے ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے اور وہ حقیقتاً خدا کی ذات ہے اس لئے ''اقرأ باسم ربک الذی خلق'' اس خالق کے نام سے پڑھو۔

لیکن وہ علم مجرد علم نہیں، وہ علم نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک دوسرے کو لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے۔ وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کے رقبہ کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے۔ وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھانے کا نام ہے بلکہ

اقرأوربك الاکرم الذی علم بالقلم ۔ علم الانسان مالم یعلم ۔

پڑھو وہ رب کریم ہے تمہاری ضرورتوں سے کیسے نا آشنا رہ سکتا ہے، اس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں بتائیں جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔

مقصد تخلیق اور اقبال

ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرة (الحدیث)

بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کیلئے پیدا کئے گئے ہو۔

جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرہ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہ رکھتا ہو وہ ہنر کیا (فنون لطیفہ)

علامہ کے مطابق اس امت کا معجزہ قرآن ہے

زندگی کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے　　زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے　　ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
(ضرب کلیم)

اقبال علم کے تدبر و تفکر کو قرآنی انداز میں پیش کرنے کا خوب فن جانتے ہیں اس لئے کہ اس کی دعوت قرآن میں بارہا اور الگ الگ اسلوب سے دی گئی ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی　　جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں　　جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو
نادان ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے　　اسباب ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو
فطرت کے نوامیں یہ غالب ہے ہنر مند　　شام اس کی ہے مانند سحر صاحب پرتو

علامہ علم کو خلافت الٰہیہ کا لازمی خاصہ مانتے ہیں تا کہ انسان اپنی ذمہ داری سے الگ نہ ہو ،خود بینی و جہاں بینی کے ذریعہ خدا تک رسائی کا ملکہ حاصل کرے یہ صفت خود بارگاہ رب العالمین نے انسان کو عطا کی ہے۔

واذا قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة

اور یاد کیجئے اس وقت کو جب کی آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں (سورہ بقرہ)

وعلم آدم الاسماء كلها اور آدم کو تمام چیزوں کا علم اللہ نے دے دیا۔ علامہ اقبال اسی خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

تو راز فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا　　خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے　　نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

(بانگ درا)

اقبال اسی جذب وشوق اور بار خلافت کو لئے ہوئے خالق ارض وسما سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تو نے ہمیں علم الاسماء کا سبق دیا ہے اور ہم نے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ، ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی خیاباں وگلزار وباغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اے خدا تو نے رات پیدا کی میں نے چراغ بنا ڈالا ،تو نے مٹی پیدا کی میں نے پیالہ بنا ڈالا ،تو نے ویرانے جنگل پہاڑ بنائے میں نے ان کو گلزار بنا ڈالا۔ میں تو وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ سازی کا کام کرتا ہوں اور وہ ہوں جو زہر سے شربت تیار کرتا ہوں۔

اقبال جب اس خلافت کے نمونہ کو قرآن مجید کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا (سورہ فتح ۲۹)

اور جب اس ترغیبی انداز سے بات بنتی نظر نہیں آتی تو فوراً تربیتی انداز میں نوجوان کو مخاطب کرتے ہیں کیوں کہ اسی کی جواں سالی اور اس کا جوش وولولہ جو خلافت کا بار امانت اٹھائے ہوئے ہے وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

مولانا علی میاں ندوی نقوش اقبال میں علامہ اقبال کے تخیل کی ترجمانی کیا خوب کرتے ہیں کہ:

اقبال اس مسلم نوجوان کی تمنا کرتے ہیں جس کی جوانی بے داغ، جس کی ضرب کاری ہو، جو جنگ میں شیر وپلنگ اور صلح میں حریر وپرنیاں ہو۔ جو رزم وبزم دونوں کا حق ادا کرے۔ جو نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو کی مثال اور صلح وجنگ میں مثالی شخصیت کا مالک ہو۔ جس کی امیدیں قلیل اور

مقاصد جلیل ہوں، جو فقر میں کی طرح نرم اور بزم حق و باطل میں فولاد کی طرح تند و گرم ہو، کبھی وہ شبنم ہو جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک پہونچتی ہے۔ کبھی وہ طوفان جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں۔ اگر اس کی راہ میں کوہستان و سنگ آئیں تو سیل تند رو اور محبت کا شبستان آئے تو نغمہ خواں بن جائے جو صدیق کا ایمانی جلال و حلاوت، فاروق کا صدق و عدالت، عثمان کی جود و سخاوت، حیدر کا فقر و شجاعت، بوذر کی فقر و غنا، اور سلمان کا صدق و صفا رکھتا ہو۔ جس کا یقین بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہو، جو مومنانہ حکمت و فراست کا آئینہ دار اور ہمت مردانہ کا علم بردار ہو۔ جو شہادت کو اپنا کر حکومتوں کو ٹھکرا سکتا ہو۔ جو اپنی رفعت و عظمت میں فرشتوں کے لیے بھی باعث رشک ہو۔ جس کا وجود دنیا میں کفر و باطل کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہو، جس کی قیمت پوری کائنات بھی نہ بن سکے اور جسے اس کے خالق و مالک کے سوا کوئی نہ خرید سکے، جس کے مقاصد جلیلہ اسے زندگی کی سطحیت اور زیب و زینت سے بلند تر کر چکے ہوں، جو جنگ و رنگ اور نغمہ و آہنگ کے فریب سے نکل چکا ہو، تہذیب جدید کے بلبل و طاؤس کی تقلید سے یہ کہ کر انکار کر چکا ہو۔

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

مرد مومن

مومنین کامیاب ہو گئے جو نمازوں میں خشوع کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (المومنون)

اور رحمٰن کے بندے زمین پر نرم روی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہلوں سے واسطہ پڑتا ہے تو سلامتی سے گذر جاتے ہیں (الفرقان)

وہ رات کو کم سوتے ہیں اور وقت سحر استغفار کرتے ہیں۔ (الذاریات)

مومنین تو وہ ہیں جب اللہ کا ذکر ان کے سامنے کیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (انفال)

اور رات کے حصے میں نفل کے طور پر تہجد ادا کرتے ہیں، آپ کا رب آپ کو مقام محمود عطا

کرے (بنی اسرائیل)

مومن اور آہ سحر گاہی:

چونکہ قرآن کے بموجب مومن کی اہم خصوصیات دعاء نیم شبی اور آہ سحر گاہی ہیں۔ علامہ کے انداز اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قرآن کے اس پیغام سے خوب واقف ہیں اسی لئے علامہ کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی عزیز سرمایہ ہے حتی کہ لندن کے زمستانی ماحول میں بھی یہ آداب سحر گاہی ان سے ترک نہیں ہوئے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر سی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر گاہی

آپ کا تخیل تھا کہ:

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

خود بھی اس کا خوب اہتمام کرتے اور امت میں اس کی کمی سے دل برداشتہ بھی جس کا اظہار جواب شکوہ میں آپ نے یوں کیا ہے۔

اس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

اور نوجوانان امت کے حق میں دعائیہ انداز میں کہتے ہیں کہ

جوانوں کو مری آہ سحر دے تو ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نور بصیرت عام کر دے

آپ اپنی فارسی نظم میں مومن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے مرد مسلماں! تو ناموس ازل کا امین و پاسبان اور خدائے لم یزل کا راز دان ہے۔ تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقاء متعلق ہے، تم پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تم سے روشن ہیں لیکن تمہاری ذات ہی درمیان سے غائب ہے تم کب تک غفلت و بطالت، گم نامی و جہالت کی زندگی گذارتے رہو گے۔

اے خوابیدہ کلی! تو اس نرگس بیدار کی طرح آنکھیں کھول جس کی پلکیں کبھی نہیں جھپکتی اور اسے کبھی نیند نہیں آتی، کیا بلبل کی نغمہ سنجی، اذان کی للکار اور قلب وروح کی پکار بھی تمہیں بیدار نہیں کرسکتی۔

اے بانی حرم اے معمار کعبہ! اے فرزند ابراہیم! ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ اور اپنی نیند سے بیدار ہو جا۔

تقوی اور خودی

تقویٰ کہتے ہیں اپنے آپ کو ان چیزوں سے محفوظ رکھنے کو جو آخرت میں ضرر پہونچائے اور اس سے حفاظت کے بھی دو درجے ہیں۔ اول دائمی عذاب سے حفاظت: اس میں ہر بندۂ مومن شامل ہے جو شرک وکفر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔ دوم ہر گناہ سے بچنا اور اس کے وبال سے اپنے آپ کو دور رکھنا اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کے سوائے کسی کا خیال نہ آئے۔ دل مثل آئینہ صاف وشفاف ہو، خدا سے رجاء وامید اور عشق کا اعلیٰ ترین درجہ ایسا ہو کہ ذات اس کی صفات کا پرتو بن جائے اور زندگی مکمل احسان یعنی (ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک) کہ اللہ کی ایسی عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے، کا مظہر بن جائے۔

اسی لئے قرآن میں بار بار تقویٰ کی بات کہی گئی ہے۔

الم ذالك الكتاب لاريب فيه ، هدى للمتقين

يا ايها الذين آمنوا تقوا الله وقولوا قولاً سديدا

يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله و كونوا مع الصادقين

علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کے بارے میں ڈاکٹر محمد رفیع اپنی تصنیف ''حکمت اقبال'' میں لکھتے ہیں کہ خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خود شناس وخود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو۔ علامہ کے نزدیک خودی ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہو، یہ ایک نورانی طاقت ہے جو ذات عرفان تک پہونچ سکتی ہے۔

علامہ نے اسرار خودی کے دیباچہ میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اس کا مفہوم محض

احساس نفس یا یقین ذات ہے یہ احساس تقویٰ کی تعریف کے ایک زمرے میں شامل نظر آتا ہے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی — شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ
خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا — مقام رنگ وبو کا راز پاجا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ — کف ساحل سے دامن کھینچتا جا
خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل — اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل
عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل
یہ موج نفس کیا ہے ؟تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے ؟ راز درون حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بد مست وخلوت پسند — سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

حب رسول: قرآن کا فرمان ہے کہ:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

اقبال کے قلب وجگر میں یہ احکامات اس قدر پیوست تھے کہ ان کا حب رسولؐ وجدان تک پہونچ گیا تھا، آپ کے مطابق کائنات عشق کی مرہون منت ہے اور عشق کا منبع ومصدر آپ ﷺ کی ذات اور آپ کا قلب سلیم ہے۔ سرور عشق کا حصول آپ ہی کا بادۂ دیرینہ سے ہوسکا۔

جہاں عشق مستی از سینۂ است
سرورش از مئے دیرینہ تست

ارمغان حجاز کی نظم ''حضور رسالت'' میں فرماتے ہیں۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ

علامہ کے مطابق عزت وتوقیر صرف اور صرف نبی معظم ﷺ کے طریقہ کو اپنانے میں ہے، مسلمان جب تک کتاب اللہ اور سنت رسول اکرم پر عمل پیرا ہے اور عقل وتدبیر کا استعمال کرتا رہے ،تقدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے خدائے وحدہ لاشریک لہ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کریں تو یہ دنیا ان کے قدموں میں ڈال دی جائے گی۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

خلاصہ کلام یہ کہ علامہ اقبال کے کلام کے مختلف اسالیب میں سے ایک قرآن کا طالب علم جتنا غور کرے گا ہر نظم میں کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا مل جائے گا جو ان کے کلام کو قرآنی اسلوب سے ہم آہنگ کردے گا۔ آپ کے کلام کے آج تک تروتازہ رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ قرآن جو لافانی کلام ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اللہ نے لیا ہے۔ اب جس نے بھی اپنے کلام کو اس کلام الٰہی کے پرتو سے صیقل کیا اور جس مقدار میں کیا تو کلام اللہ کی ضیا پاشیوں نے اس کو رفعتوں تک پہونچادیا۔ جس نے بھی اللہ کی کبریائی اور علوشان کے بیان کو اپنا شیوہ بنایا تو اللہ نے اس کی بڑائی لوگوں کے دلوں میں ڈال دی۔ یہی چیز ہمیں علامہ اقبال اور ان کے کلام میں نظر آتی ہے جس کا برملا اظہار وہ یوں کرتے ہیں کہ

ولایت ، پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

آخر میں علامہ کی زبانی ہم سب کی یہ تمنا ہے کہ

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کرے

حوالہ جات

۱۔ قرآن مجید

۲۔احادیث مبارکہ	
۳۔تشریح القرآن	مولانا عبدالکریم پاریکھؒ
۴۔نقوش اقبال	سید ابوالحسن علی ندویؒ
۵۔پیام اقبال بنام نوجوانان ملت	سید قاسم محمود
۶۔راز اقبال	خلیل الرحمٰن راز
۷۔اقبال ادبی وتہذیبی ورثہ	انیس چشتی
۸۔مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۹۔دعوت فکر وعمل	سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
۱۰۔کلیات اقبال	ڈاکٹر سر محمد اقبال

☆☆☆☆☆

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ یہ لذت کہاں موسیقیٔ گفتار میں
ہمنشینِ نرگسِ شہلا،رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن ،ہمسایۂ بُلبُل ہوں میں
شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے
بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند

اقبالؔ

☆☆☆

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین

اقبال اور صغریٰ ہمایوں مرزا

دکن سا نہیں ٹھار سنار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ
انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

ارضِ دکن کے فاضلاں کے ٹھار میں تقریباً ہر دور میں غیر معمولی خصوصیات کی حامل شخصیات نے جنم لیا ایسی ہی ایک شخصیت صغریٰ ہمایوں مرزا حیا (1884-1958) کی بھی ہے۔ ڈاکٹر صفدر علی مرزا کیپٹن ریاست حیدرآباد کی بیٹی، بیرسٹر سید ہمایوں مرزا کی زوجہ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر منفرد اور ممتاز مقام کی حامل رہیں ان کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے

نام ان کا ہے ، کام ان کا ہے
کام ہی کام ، وصف جن کا ہے

صدیوں پر محیط ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دکن نے ہر مشکل مرحلہ پر رواداری کا مظاہرہ کیا۔ تقریباً تمام بڑی تحریکیں اسی خطۂ ارض سے شروع ہوئیں، قدیم علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی اصلاح میں اس زرخیز مٹی میں نمو پانے والی ہستیوں نے قابلِ قدر اضافہ کیا۔

1857ء کے غدر کے بعد جو بیداری اہلِ ہند میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً پیدا کرنے کی شعوری کوشش ہوئی اس میں تبدیلی کے اثرات کو دیرپا بنانے کے لئے خواتین کی تعلیمی صورتِ حال کا جائزہ لینے اور انھیں بھی زندگی کے نشیب و فراز سے ہم آہنگ کرنے کا خیال اہلِ قلم حضرات کے دل و دماغ میں پیدا ہوا۔ ارضِ دکن میں بھی ایسی کوششیں ہوئیں۔ اونچے طبقے میں

خواتین کی تعلیمی ترقی کا خاص خیال رکھنے کا رجحان جو کہ ابتدا میں موجود تھا۔ درمیان میں نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اہمیت اختیار کرتا جارہا تھا چنانچہ محبّ حسین نے ''مسلم نسواں'' کے نام سے ایک رسالہ 1894ء میں شروع کیا تھا یہ رسالہ ماہِ محرم ۱۳۱۶ھ سے شائع ہوا۔ اس کے پہلے صفحہ پر اشتہار درج تھا۔

''یہ رسالہ ہر قمری مہینہ میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔''

اس کا موضوع 'عورت' ہے جس کی ہر ایک بات سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کی غایت، ترقی، تعلیم وتہذیب نسواں ہے جس کی ضرورت ملک وملت کو بہت ہے۔ اس رسالہ کا حجم تقریباً 64 صفحہ کا ہے۔''

ایسی فضا میں بیگم صفریٰ ہمایوں مرزا نے ہوش سنبھالا۔ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں والدہ سے پڑھیں۔ کچھ معلمین سے بھی حصولِ علم کا موقع ملا اور 1901 میں عملی زندگی کا آغاز ہوا سید ہمایوں مرزا سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ وہ روشنِ خیال وسیع النظر تھے ایک ممتاز بیرسٹر ہونے کے علاوہ ایک خوش گو شاعر مورخ اور باکمال نثر نگار بھی تھے ان کے تعاون نے صفریٰ بیگم کو مزید باہمت بنادیا اور انھوں نے سماجی، صحافتی، ادبی اور معاشرتی اصلاح کا تہیہ کیا۔ انجمن خواتین دکن کی بنیاد لیڈی اور کر اور چند دیگر یوروپی خواتین کے ساتھ مل کر ڈالی۔ انجمن خواتین اسلام کی بنیاد مسز خدیو جنگ بہادر کی شراکت میں رکھی، غریب مفلس اور نادار لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اپنے والد کے نام وقف کر کے ہمایوں نگر میں ''مدرسہ نسواں صفدریہ کا 1934ء میں قیام عمل میں لایا اس میں مکتبی تعلیم کے ساتھ صنعت وحرفت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی ان سماجی بھلائی کے اقدامات سے بہرہ ور ہونے کے لیے جس سماجی شعور کی ضرورت تھی اس کے لیے صفریٰ ہمایوں مرزا نے صحافت کا سہارا لیا۔ محبّ حسین کا ''مسلم نسواں'' بند ہو چکا تھا انھوں نے ''النساء'' کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا۔ Gail Minauly نے اپنی کتاب Selected Scholors کے ص 151 پر ''معلم نسواں'' اور محبّ حسین کے ساتھ صفریٰ ہمایوں مرزا اور ان کے رسالے کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ اقتباس

" The first urdu jounal for women in Hyderabad of course was Muhib Hussain's Out spoken Moolilme.Niswan". After its

demise in 1901 there was a long hault untill a young generation of women inspired by his example , began editing jouanals of their own.

Among the women's Journals published in Hyderabad was "An -Nissa" a monthly publication devoted to social reform and creative literature that appears between 1919 and 1927 edited by Sugra humayun Mirza"

اس رسالے میں دوسرے مرد وخواتین کے ساتھ مختلف اصلاحی موضوعات پر محترمہ کا قلم اپنے مخصوص پر اثر انداز میں خامہ فرسائی کرتا۔ ان کی کاوشوں کا اس وقت کے اکابرین نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔ علامہ اقبال بھی جو 1910ء میں ہی حیدرآباد آچکے تھے اس سے متاثر ہوئے صفریٰ ہمایوں مرزا نے اپنا رسالہ انھیں بھی ارسال کیا۔ علامہ نے لاہور سے صفریٰ ہمایوں مرزا کے نام اپنے مکتوب میں رسالے کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے اقتباس۔

''مکرمہ

النساء کے لیے نہایت سپاس گذار ہوں۔ یہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ مسلمان عورتوں کے لیے بہت سبق آموز ہوگا میں کچھ مدت سے اردو میں بہت کم لکھتا ہوں۔ لیکن اگر کچھ اشعار ہو گئے تو بھیج دوں گا۔ تسلیم

محمد اقبال بیرسٹر لاہور

مکتوب مؤرخہ ۲۸ نومبر ۱۹۲۲ء

غالباً خط وکتابت اور اثر پذیری کا سلسلہ جاری رہا کیوں کہ صفریٰ ہمایوں مرزا کی زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نیکی، خدا ترسی، پختہ عقیدہ، سادہ سلیس رواں زباں اور پر اثر انداز جہاں ایک طرف ان کے مزاج اور فطرت کا عکاس ہے وہیں دوسری طرف کلامِ اقبال کی روح سے اثر پذیری کا غماز ہے ایک خط میں اصلاح کی بابت بھی بات چیت ملتی ہے اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

لاہور/۱۲جولائی ۱۹۲۸ء

محترمہ تسلیم

آپ کے اشعار صاف ہیں۔ افسوس کہ میں فنِ اصلاح سے نابلد ہوں۔ محض آپ کے تعمیلِ ارشاد کے خیال سے بعض جگہ کچھ الفاظ بدل دیے ہیں۔ رسالہ نور جہاں امرتسر میں بھیج دیجے۔ میری بیوی سلام عرض کرتی ہیں۔

مخلص

محمد اقبال

ان خطوط سے اس اثر پذیری کا اظہار ہوتا ہے جو صفریٰ ہمایوں مرزا کو کلامِ اقبال سے حاصل ہوئی۔ ''ترانۂ ہندی کا عکس'' ''ترانۂ وطن'' میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

ملکی ہیں ہم وطن ہے ملکِ دکن ہمارا
یہ ہے زمیں ہماری یہ ہے وطن ہمارا
ہم ڈیڑھ سو برس سے آکے بسے ہیں اس جا
یہ ہے زمیں ہماری چرخ کہن ہمارا
رکھتے ہیں جس کی الفت گاتے ہیں جس کے نغمے
آقا ہے بندہ پرور شاہِ دکن ہمارا

اصلاح پسندی، تغزل، سادگی اور نظریات کی مماثلت دیکھیے لکھتی ہیں۔

نہ ترک ہے نہ طلب ہے مقام مسلم کا
ہے جاوداں سفرِ نا تمام مسلم کا
ہیں چور چور قیاس وگماں کے پیمانے
مئے یقیں ہے چھلکتا ہے جام مسلم کا
سکوتِ نیم شبی وفغانِ نیم شبی
یہی سلام یہی ہے پیام مسلم کا

(رسالہ زیب النسا ستمبر 1940 ص53)

ان شخصی روابط ومراسم کا نقطۂ عروج وہاں نظر آتا ہے۔ جب حیدرآباد میں 7 جنوری 1938ء کوٹاون ہال باغ عامہ میں ''یوم اقبال'' منایا گیا۔ یہ جلسہ پرنس آف برار ولی عہد سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا اور مختلف اہم شخصیات نے اس میں تقریریں کی تھیں۔ عورتوں میں صرف صغریٰ ہمایوں مرزا نے تقریر کی تھی۔

کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم مرتبہ سید مظفر حسین برنی میں اقبال کے خطوط صغریٰ ہمایوں مرزا کے نام شامل ہیں۔ ان میں اقبال نے ''پیام مشرق'' کے جلد ہی شائع ہونے کی اطلاع اور اشاعت کے بعد بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ جنوری 1938 کے ''زیب النساء'' کے صفحہ 6 پر صغریٰ ہمایوں مرزا نے ''پیامِ مشرق'' کے حاصل ہو جانے اور اقبال سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کا ذکر کیا ہے اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ ''یوم اقبال'' اقبال کی زندگی میں ہی منایا جا رہا ہے جب کہ اکثر و بیشتر اہل کمال کی قدر و منزلت ان کے مرنے کے بعد ہی تسلیم کی گئی۔

اسلامی نظریات کی روح پر کاربند اس دلیر بے باک اور نڈر خاتون نے اقبال کی وفات پر 1938ء کے ''زیب النساء'' میں ''یاد اقبال'' کے عنوان کے تحت اپنے رنج وغم اور قومی نقصان کا اظہار کرتے ہوئے علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ مختصراً نظریات، نصب العین اور اعمال وافعال کی ہم آہنگی نے ان دو ہم عصر شخصیات کو جو دو مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتی تھیں جذب وقبول کے بندھن میں باندھا اور دوستی اور اثر پذیری کے دھاگے میں پرویا۔ اس دور کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ خواتین کی تعلیم کا رواج نہیں تھا صغریٰ ہمایوں مرزا وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے پردے سے باہر آکر ایک ادبی محفل میں اظہار خیال کیا۔ ان کی اس کاوش پر یقینی طور پر انھیں تنقیدوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کے مطابق اقبال اور صغریٰ ہمایوں مرزا انگلینڈ سے ہی دوست رہے اور اپنے دوست کی ادبی صلاحیتوں کے اعتراف میں وہ آگے آئیں۔ ان کے بھتیجے کرنل یوسف مرزا کے انٹرویو کے مطابق اس کے دوسرے ہی دن کے اخباروں میں ان کے خلاف کفر کے فتویٰ کا اعلان ہوا۔ کیوں کہ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے پردے کے باہر آکر مردوں کے مجمع میں تقریر کی تھی۔ صغریٰ ہمایوں مرزا نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ عملی طور پر اپنے کام اور اپنی تخلیقات میں قریب قریب انھیں نظریات کا اعادہ کیا جن کی طرف

علامہ نے ملتِ اسلامیہ کو متوجہ کرنا چاہا۔ اپنے رسائل، ناول، مضامین، سفرناموں اور کلام میں وہ اپنے تجربات، اپنے نظریات اور اپنے خیالات کو سیدھے سادھے اور واضح انداز میں پیش کرتی رہیں مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے نصب العین پر روشنی پڑتی ہے لکھتی ہیں۔

مطلب نہ زندگی سے نہ آرام سے غرض
مجھ کو فقط ہے فائدہ عام سے غرض
مشرب مرا ہے قوم کی خدمت بس اے حیاؔ
کچھ کفر سے غرض ہے نہ اسلام سے غرض

☆☆☆

آہ یہ مرگ دوام آہ یہ رزمِ حیات
ختم بھی ہوگی کبھی کس مکش کا ئنات
عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات
خوار ہوا کس قدر آدم یزداں صفات
قلب و نظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات
کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات؟
اقبالؔ

☆☆☆

پروفیسر مجید بیدار

صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

علامہ اقبال کے مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسم

تعلقات اور مراسم کی استواری اسی وقت ممکن ہے جب کہ دو انسانوں میں ہم خیالی اور دینی و دنیاوی معاملات میں ہم آہنگی برقرار ہے۔ جہاں تک دنیاوی معاملات کے سلسلے میں ربط وتعلق کا معاملہ ہے اس کی بنیادیں اسی وقت مستحکم ہوتی ہیں جب کہ کوئی انسان دوسرے انسان سے متاثر ہو اور دوسرے کی شخصیت میں اپنے پرتو کو شدت سے محسوس کرے۔ یہ ایک ایسا بنیادی نکتہ ہے جس کا عرفان مشکل نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن شہر حیدرآباد کی مایہ ناز شخصیت مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور اردو شاعری کے تابناک مفکر ڈاکٹر علامہ اقبال کے تعلقات کے سلسلے میں جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس طرح مہاراجہ کشن پرشاد کو انتظام مملکت اور اقتدار میں انسانیت کو فروغ دینے میں کمال حاصل تھا اور وہ ایک بہترین منتظم اور مسلم مملکت کے وزیر اعظم کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے تھے اسی طرح شعر وسخن کے توسط سے علامہ اقبال کو عالمانہ اور مفکرانہ افکار کی وجہ سے سارے ہندوستان میں انہیں بلند مرتبہ حاصل تھا اس اعتبار سے مہاراجہ کشن پرشاد نہ صرف علامہ اقبال کے مزاج داں قرار پائے بلکہ خود اقبال کو کشن پرشاد سے تعلقات اور تبادلہ خیال سے یک گونہ سکون حاصل ہوتا تھا۔ اقبال اور کشن پرشاد کے تعلقات میں استواری کی دو اہم وجوہات تھیں اور ان دو وجوہات کا تعلق نہ تو عزت اور دولت سے تھا اور نہ ہی شہرت اور دینداری کی وجہ سے بلکہ سچائی اور دین داری کے جس فلسفے کو علامہ اقبال اسلام کے توسط سے اپنی شاعری میں فروغ دے رہے تھے ان ہی افکار سے مہاراجہ کشن پرشاد کی فکر اور سوچ بھی مالا مال تھی یہی وہ بنیادی فلسفہ ہے جس کے توسط سے نہ صرف علامہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد سے خط وکتابت کی بلکہ ان سے شخصی ملاقاتوں سے ایسا ماحول تیار کیا جس میں دو بڑی شخصیتوں کی ذہنی ہم آہنگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

حیدرآباد جیسی ریاست اور اس ریاست کے فرماں روا کی حیثیت سے چھٹے نظام میر محبوب علی خان اور ساتویں نظام میر عثمان علی خان کے دور کو گو کہ بادشاہت کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے لیکن ان دونوں بادشاہوں نے عوامی زندگی میں سدھار اور علم و ہنر کی ترقی کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو بادشاہوں کے دور میں وزارت کے عہدے پر فائز رہنے والے کئی اشخاص کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہوسکا جو مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کو حاصل ہے ۔ بنیادی طور پر شادؔ کا تعلق سکھ گھرانے سے تھا اور انہوں نے خواجہ حسن نظامی سے ارادت حاصل کر کے خود کو صوفی اور فقیر کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا، اس کے علاوہ کشن پرشاد کی یہ خصوصیت تھی کہ انہوں نے اپنے اقدامات اور رویے کے ذریعہ اسلام دوستی کی مستحکم بنیاد رکھی تھی اور علامہ اقبال نہ صرف ان خصوصیات سے متاثر تھے بلکہ وہ یہی چاہتے تھے کہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے علاوہ اس کے فلسفے کو عالمی سطح پر سربلندی عطا ہو جس کے لیے ان کی نظر میں موزوں ترین شخصیت مہاراجہ کشن پرشاد کی رہی ۔ علامہ اقبال نے ایک وزیر اعظم یا اربابِ اقتدار سے ربط و تعلق رکھنے والی شخصیت کی حیثیت سے مہاراجہ کشن پرشاد کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کی فطرت میں شامل وہ اخلاق اور اقدار کو پسند فرمایا جو کسی بندۂ خدا کی شان کا درجہ رکھتے ہیں اور علامہ اقبال نے جس فکر کے ذریعہ تصور خودی ، تصور عشق اور تصور فقر کے توسط سے مرد خود آگاہ اور مرد خدا پسند کا تصور پیش کیا ہے ۔ ان تمام خصوصیات کی ہم آہنگی ڈاکٹر علامہ اقبال کو حیدرآباد کی ایک ہی شخصیت میں دکھائی دیتی تھی اور وہ شخصیت مہاراجہ کشن پرشاد کی تھی ۔ ان دونوں شخصیتوں کے خطوط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف فکری توازن ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے بلکہ ان دونوں شخصیتوں نے ناموری اور سربلندی کی خاطر ربط و تعلق کو استوار نہیں کیا بلکہ حکیمانہ افکار اور اخلاقی خصوصیات جیسی مشرقی روایات کو عالمی سطح پر فروغ دینے کے لیے خط و کتابت کی ۔ شاد اور اقبال میں جاری مراسلت اور ان کے تعلقات کی نمائندگی سے زیادہ خط و کتابت کے دوران ان دونوں اشخاص کے درمیان پھلنے پھولنے والی اس کیفیت کو اہمیت دی جانی چاہئے کہ جس کے توسط سے انہوں نے مشرقی طرزِ نظام کو پسند کرتے ہوئے مغربی طرز زندگی کی مخالفت کی طرف خصوصی توجہ دی ۔

اقبال کے ایک خط کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے بعض اہم مذہبی نکات سے پردہ ہٹاتے ہوئے مہاراجہ کشن پرشاد کو حقیقت سے آگاہ کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ لاہور سے ۵ جنوری ۱۹۱۷ء کو لکھے خط میں انہوں نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اس سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی فکر درحقیقت آپسی اتحاد اور اس کی شہرت رہا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

''علی شاہ صاحب کو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں وہ ہمارے ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ پیری و مریدی کے آغاز سے پہلے بھی جانتا تھا اور اب بھی ان کے حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ایک دفعہ بنگلور میں ان کی وجہ سے فساد ہونے کو تھا۔ ان کا وجود مسلمانوں میں اختلاف کا باعث ہوا۔ وہاں کے مسلمانوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ میں ان کے حالات بلا رورعایت لکھوں تا کہ فساد رفع ہو۔ میں نے جو کچھ مجھے معلوم تھا لکھ دیا اور الحمد اللہ کہ وہ فساد رفع ہوگیا اور حافظ صاحب مع اپنے مریدوں کے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ وہ بڑے ہوشیار آدمی ہیں اور پیری و مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور ان میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں''۔

(شاد اقبال از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بار اول۔ ۱۹۴۲، ص ۲۳، ۲۴)

علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد کی مراسلت کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اقبال نے اپنے خطوط کے دوران نہ صرف مہاراجہ کشن پرشاد کے اختیار کردہ رویے کے حمایت کی ہے بلکہ وہ خانقاہی نظام کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ جب کہ شاعری میں وہ ملا اور مولوی کی اس روش سے نالاں ہیں جو اسے مذہب کی روح سے دور کرتی ہے جب کہ خطوط کے ذریعے اقبال نے خانقاہی نظام کی حمایت کی ہے۔ اسی طرح مہاراجہ کشن پرشاد بھی علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر ہو کر ان تمام رویوں کی حمایت کرتے ہیں جس کے ذریعے اقبال نے اسلامی روح کی حمایت کی ہے۔ خود علامہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کی ہستی میں موجود بے شمار خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہوئے جس حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

''مہاراجہ کشن پرشاد ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جس کو ہندوستان اور دکن میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا سنگم کہا جاسکتا ہے۔ ان کی اخلاقی تعمیر عجیب ہمہ گیر صفات کے مسالے سے ہوئی تھی، آج ہم کو ان کے مرتبہ رکھنے والوں کی صف میں ایک آدمی بھی ان صفات سے متصف نظر نہیں آتا۔ اور کوئی مسئلہ نہ تھا جس میں وہ اپنی رائے نہ رکھتے ہوں۔ فلسفہ، تصوف، علم کلام، شعر وادب، ہر فن کے باکمال لوگ اگر کسی کی محفل میں یکجا دیکھے جاسکتے تھے تو وہ مہاراجہ کشن پرشاد کی محفل تھی''۔

(مجلّہ عثمانیہ مہاراجہ کشن پرشاد نمبر جلد ۱۳، شمارہ ۴، ص ۹۰)

اقبال کی عقیدت اور قدر افزائی اس وجہ سے نہیں تھی کہ مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے بلکہ ان کی شخصیت میں موجود بے شمار خصوصیات کی بنا پر علامہ اقبال نے ان سے ربط وتعلق کی بنیاد مستحکم کیا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے بیشتر خطوط میں اقبال سے خطاب کرتے ہوئے انہیں، مائی ڈیر اقبال'' کی خطابت سے نوازا ہے جب کہ اقبال نے جب بھی مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسلت کی تو ایسے وقت انہیں، سرکار والا تبار تسلیم مع التعظیم، کے القاب یا پھر کبھی، سرکار والا تبار، کی خطابت کو اختیار کیا ہے اور اس قسم کے القاب سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے ہمیشہ مہاراجہ کشن پرشاد کی تعظیم کو ملحوظ رکھا۔ ان دونوں اشخاص کے دوران جاری خط وکتابت سے صرف ان کے ذاتی احوال کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ اس دور کی مذہبی زندگی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں پیدا ہونے والی بے چینی کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ اقبال نے ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ کو مہاراجہ کشن پرشاد کو خط لکھ کر جس اہم موضوع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس کی جھلک ملاحظہ ہو۔

''افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے اگر یہی حالت رہی تو آئندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہوجائے گی۔ زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ سرکار عالی کا مزاج بخیر ہوگا''۔

(شاد اقبال۔ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ص ۱۳۹)

علامہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد سے جس قسم کے تعلقات کو استوار کیا تھا ان میں صرف شخصی اور

ذاتی گفتگو ہی اہمیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ملکی وقومی مسائل پر بھی ان کی نظر ہوتی تھی، کشن پرشاد شاد اور اقبال کے خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان دو بڑی شخصیتوں نے صرف تعلقات کی استواری کے لیے ہی خط وکتابت نہیں کی بلکہ سماج اور معاشرے کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کوشش کی کہ نہ صرف مسائل کا حل تلاش کیا جائے بلکہ قوموں اور ملتوں میں باہمی تعاون کو فروغ دیا جائے۔ علامہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کی تائید میں مدحیہ قصیدے اور اشعار بھی لکھے جس سے خود اقبال کی عقیدت کا پتہ چلتا ہے اور مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی اقبال اور ان کے افکار کو واجب تعظیم سمجھا۔ دونوں شخصیتوں کے درمیان قائم دوستی اور خط وکتابت کے موضوعات کی فہرست تیار کی جائے تو بلاشبہ ایک بہت بڑا دفتر تیار ہو جائے گا۔ شہر حیدرآباد میں علامہ اقبال کی آمد بھی مہاراجہ کشن پرشاد کی مرہون منت ہے اور اقبال کی شاعری پر کشن پرشاد کی شخصیت کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے جہاں تک اقبال اور شاؔد کے تعلقات کا معاملہ ہے ان دونوں شخصیتوں نے گو کہ باہمی روابط کے لیے خطوط لکھے لیکن ان خطوط میں جہاں اقبال کی شاعرانہ فکر کی توضیح نظر آتی ہے وہیں مہاراجہ کشن پرشاد کی حیدرآبادی تہذیب کی یگانگت اور بھائی چارگی کی خوبو بھی بسی ہوئی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو کشن پرشاؔد کی شخصیت سے ہی نہیں بلکہ حیدرآباد اور یہاں کی ریاست کے علاوہ اس ریاست کے باشندوں سے والہانہ محبت تھی اور وہ کشن پرشاد کی شخصیت سے اسی لیے متاثر تھے کہ ان کی طبیعت میں صوفیانہ مزاج کی ہم آہنگی تھی اور اس مزاج کو علامہ اقبال اس لیے اہمیت دیتے تھے کہ درحقیقت کسی انسان کی فطرت میں ایسی شان بے نیازی کی وجہ سے خدا پرستی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ چونکہ اقبال نے کشن پرشاد کی شخصیت میں ان کیفیات کو محسوس کیا تھا اسی لیے جس قدر خطوط کا ذخیرہ علامہ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد سے مراسلت کے ذریعہ اردو دنیا میں چھوڑا ہے وہ خطوط علامہ اقبال کے دل کی آواز میں اور حیدرآباد سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ غرض اقبال نے ہندوستان کے کئی شہروں جیسے بھوپال اور لاہور سے بے محابانہ محبت کی ہے لیکن حیدرآباد سے ان کی انسیت ووابستگی جس انداز کی ہے اس کا ثبوت کسی اور شہر سے وابستگی کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

محمد آصف

ریسرچ اسکالر
جے۔این۔یو۔نئی دہلی

اقبال کا تصورِ سرمایہ داری

(موجودہ عہد کے تناظر میں)

شاعر طبعًا باغی ہوتا ہے ۔اُسے سماج کے بنے بنائے اقدار پریشان کرتے رہتے ہیں ۔اس کی بے چین روح نت نئی خیالی دنیا کو تخلیق کرتی رہتی ہے ۔اس خیالی دنیا کو حقیقت میں بدلنے کے لئے وہ سخت مراحل سے گزرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ بنی بنائی دنیا کو زیروزبر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اسے نئے سرے سے تعمیر کرتا ہے۔ یہ تخلیقی سفر مسلسل بلا کسی روک ٹوک کے چلتا رہتا ہے جو اسے ایک ایسی یوٹوپیائی دنیا میں لے جاتا ہے جو حقیقت میں موجود تو نہیں ہوتی ،لیکن اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔فیض نے بھی آزادی سے پہلے یوٹوپیائی دنیا کا خواب دیکھا تھا جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تو فیض نے یہ اعتراف کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ' یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

شاعر اپنی قوم وملک کا نبض شناس ہوتا ہے۔وہ دیدۂ بینائے قوم اور افکار کی دنیا کا مسافر ہوتا ہے۔اپنے افکار ونظریات سے سماج کی تاریکی وتیرگی کو دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قوتِ گویائی کے زور سے معاشرے کی تعمیر وترقی میں اہم رول ادا کرتا ہے اور ایک ایسے مثالی سماج کی تخلیق کا خواب دیکھتا ہے۔ جہاں مسرت وفارغ البالی ہو۔سماج کے سبھی طبقوں کو یکساں حقوق ومراعات حاصل ہوں۔

تاریخ دائروں میں سفر کرتی ہے۔ یہ دائرے حصار بند اور مکمل نہیں ہوتے شاعر اپنے تصور اور تخئیل کی توانائی و جوش سے سابقہ دائرے میں شگاف ڈالتا ہے۔ اور دائروں کا یہ سلسلہ نئی قوت ونئی جدت سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اقبال نے تاریخ کی وِسیس سرکل کو ایسے دور میں توڑا جب دنیا مذہب کے بجائے سائنس اور ایمان کی جگہ علم کی طرف مائل تھی اور انسانی زندگی کے مسائل کا حل مذہب کے بجائے عقل و منطق میں تلاش کیا جارہا تھا۔

جن سوالوں کا جواب مذہبی تعلیمات میں نہیں ملا' ان کا حل علم نفسیات میں تلاش کیا جانے لگا۔ ایمان رفتہ رفتہ علم میں تبدیل ہوگیا اور یہ تصور کرلیا گیا کہ اگر ایمان علم پر مبنی نہ ہوتو وہ توہمات ہے۔ مذہب اور اسائنس کے اس تضاد نے وقت کے آزر سے کئی صنم تراشوائے۔ ایسے پرآشوب اور عزم شکن دور میں اقبال نے ذات الہیہ' جبر وقدر' حیات بعد الموت اور اسلام میں اجتہاد کا تصور پیش کیا۔ اور سائنسی قوانین کے اس طلسم کو توڑا' جس کی بنیاد انسانی زندگی اور کائنات کو عقل وشعور کے حوالے سے سمجھنے پر پڑی تھی۔ ساتھ ہی اقبال نے انسان کامل اور مرد مومن کا فلسفیانہ تصور پیش کیا۔ اور یہ انسان کامل احکام الہی کا تابع اور فرمانبردار تھا' اُس کے اندر خودی کی آگ روشن تھی۔ اپنی قابلیت اور عظمت پر نازاں ہونے کے ساتھ ساتھ عجز وانکسار کا بندہ تھا۔ مجذوب نیتشے کے دہریہ فوق البشر کی طرح شتر بے مہار اور ملحد ولادین نہیں تھا۔ جو ببانگ دہل یہ اعلان کرتا پھر رہا تھا کہ نعوذ باللہ'' We are " Murderer of god علامہ اقبال نے ملوکیت کی جمہور دشمن پالیسی پر کھل کر تنقید کی ہے۔ کیوں کہ یہ نظام عام انسانوں کے خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس میں بیچارے غلام اور کسان بے بسی ولاچاری کے عالم میں پسے اور کچلے جارہے تھے۔ ملکویت کے جواب میں اشتراکی نظام آیا' اس میں بھی حقوق انسانی اور اخلاقیات کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اقبال نے کارل مارکس سے اپنی عقیدت مئودت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'' اس کی وجہ یہ تھی کہ مارکس نے دنیا کو طبقاتی کش مکش' دولت کی مساویانہ تقسیم اور جدلیاتی مادیت کا فلسفہ دیا تھا' جس کی وجہ سے پچھلی تمام تہذیبی وتمدنی تاریخیں' جس کی بنیاد طبقاتی تفوق پر تھی' تہہ وبالا ہوگئی۔ مارکس نے عوام الناس کا خون چوسنے اور غلام بنانے والی ڈھونگی ملوکیت کے نظام کو بدلنے کا عزم مصمم کیا تھا۔ اور یہ کہا کہ'' دنیا کے مزدور

ایک ہوں اب تمہیں کچھ کھونا نہیں ہے سوائے اپنی زنجیروں کے'' اس اعلان نامے نے محنت کشوں اور غلاموں کے ذہنوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور اس طبقے نے کلیسا اور حامیان دین کے استبدادی رویہ کو راکھ میں ملا دیا۔ جن کی قبا ان کے خون سے رنگی ہوئی تھی۔ طبقاتی کشمکش کا فلسفہ یہ تھا کہ ہر طبقاتی جدوجہد سیاسی تصادم میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بالآخر معاشی آزادی کا سوال بن کر ابھرتی ہے۔ دراصل طبقات کا وجود پیداوار کے ارتقا کی مخصوص تاریخی منزلوں سے مربوط ہے۔ جو لازمی طور پر پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کی طرف لے جاتی ہے اور یہ پرولتاریہ ڈکٹیٹرشپ ایک بورژوا سماج کی تخلیق کرتی ہے۔ جب تک انسانوں میں ہوس دنیا و اقتدار کی خواہش باقی رہے گی تب تک دنیا چنگیزی اور پرویزی سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ نپولین نے کہا تھا کہ ''انقلاب فرانس کے نتیجے کے طور پر جاگیرداروں کا خاتمہ تو ہو جائے گا لیکن ان کی جگہ تاجر اور سرمایہ دار بورژوا لے لیں گے۔ بات وہیں کی وہیں رہے گی۔'' اقبال کا بھی تصور یہی تھا کہ مذہب انسان کے اندر اخلاقی قوت پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ مذہب انسانی اقدار کی پامالی نہیں سکھاتا بلکہ ان قدروں کی نگہداشت اور حفاظت کرتا ہے۔ کارل مارکس کا نظریہ تھا کہ طبقاتی جدوجہد کے ذریعے بورژوا طبقے کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کی جگہ پرولتاریہ طبقہ لے لے گا لیکن اس کے بعد کیا ؟ یہیں پر مارکس کا یہ تصور ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا حل اقبال یوں بیان کرتے ہیں۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

صنعتی انقلاب کی برکتوں نے اشیاء کی پیداوار کے ساتھ معیار زندگی کو بہتر کیا اور ساتھ ہی ساتھ جاگیردارانہ نظام کا زوال اور زرعی غلامی کا خاتمہ ہوا۔ بادشاہ کے اختیارات کم ہوئے اور عوام کو اظہار خیال کی آزادی ملی۔ جمہوریت کے آغاز کے ساتھ ساتھ انگلستان World Workshop میں تبدیل ہو گیا' جس کے معاشی سیاسی و سماجی اثرات جاں گسل ثابت ہوئے اور عالمی معاشرتی نظام ایک طرح کے تصادم کا شکار ہو گیا اور پوری دنیا سرمایہ دار اور مزدور طبقے

میں تقسیم ہوکر رہ گئی۔ جس کی وجہ سے ایک ایسا محنت کش پرولتاریہ طبقہ وجود میں آیا' جس کے پاس دولت نہ تھی' وہ اجرت کے بدلے اپنی محنت بیچتا اور سرمایہ دار اس محنت کا استعمال اشیاء کی پیداوار میں کرتے اور اس کو بازار میں فروخت کرتے۔ افرنگ روسیاہ کی نظر کو خیرہ کردینے والی تہذیب اور جھوٹے تصنع کی ریزہ کاری سے غریب مزدور مات کھا گیا۔ کیوں کہ یہ ازل کا فتوی ہے کہ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہی ہے۔ اس کے برعکس یوروپ کا صنعتی انقلاب سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ کو نئی قوت اور توانائی بخش رہا تھا۔ کارخانہ داروں کو اپنی صنعت کے لئے صارف کی ضرورت پڑی تو انھوں نے نوآبادیات کی تلاش کی۔

ان نوآبادیات پر اپنا سیاسی' سماجی' معاشی اور تہذیبی تسلط قائم کیا۔ کسانوں کے معاشی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کی زمینوں کو اپنی طاقت کے مفاد میں استعمال کرنے لگے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر نوآبادیات نہ ہوتیں تو انیسویں صدی کا یوروپ اتنی تیزی سے ترقی نہ کرتا۔

یوروپ کو نوآبادیات کی طرف متوجہ کرنے والا طبقہ سرمایہ داروں کا تھا تا کہ وہ غیر ملکی اشیاء' قیمتی دھات اور خام مال کو سستے داموں میں درآمد کرسکیں اور زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرسکیں۔ مالی منفعت کے اس تصور سے ویسٹ انڈیز اور لاطینی امریکہ کو مفلسی کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی معیشت یک فصلی (Monocrop) بن کر رہ گئی۔ یہی صورت حال ہندوستان کی بھی تھی۔ جہاں غذائی اجناس کے بجائے جوٹ کی کاشت کاری پر کسانوں کو مجبور کیا گیا' جس کی وجہ سے غذائی اشیاء کی ارزانی سے کساد بازاری بڑھتی گئی اور ہندوستان کے کئی علاقے قحط کا شکار ہوگئے۔ اس سے دنیا کی نوآبادیاتی معیشت اور معاشیات پر بہت برا اثر پڑا۔ ہندوستان کے کسانوں کو طویل فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑا۔ کسانوں کے دل دہلا دینے والے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں۔

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

ایسے حالات میں محکوم و مظلوم کسان اپنی بے کلاہی اور عریانی کے صدقے میں اپنے آقا کے لئے زریں تاج اور قیمتی قبا تیار کررہے تھے۔ اپنی غلامی کا پُرسہ و ماتم کرنے کے بجائے اپنی

غلامی پہ رضامند تھے کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت کو بہتر بنانے کے لئے اقبال نے اُن کو کھوئی عظمت کی یاددلائی اور تہذیب کے پردے میں چھپے ہوئے ان غارت گر، آدم کش افرنگ سیاہ کے خاشاک کو پھونک دینے کی دعوت دی۔ جو اپنے سرمایہ ودولت کی طاقت سے نوع انساں کے شکاری بن گئے تھے۔اقبال اپنی نظم فرشتوں کا گیت میں خدا کے فرمان کو فرشتوں کے ذریعہ کہلواتے ہیں جو دل کو لرزہ کردینے والا ہے۔کسانوں کی یہ حالت زار خدا کو بھی نہ دیکھی گئی۔وہ فرشتوں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے دَر و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دھقاں کو میسّر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو

سامراجی طاقتوں نے نوآبادیوں کا صرف سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر ہی استحصال نہیں کیا بلکہ ان کی تہذیبوں پر بھی استعماری حملہ کیا۔جب یوروپین شہنشاہیت اور عسکری طاقت کے آگے نوآبادیاتی عوام نے جھکنے سے انکار کیا تو انہوں نے White mens Burden کا نظریہ پیش کیا۔امپیریلسٹ تھینک ٹینک نے اس نظریے کو نوآبادیات پر اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا حالانکہ روڈیارڈ کیپلنگ نے اس موضوع کو شعری پیکر میں اس وجہ سے ڈھالا تھا کہ نوآبادیات کی توسیع اور ان پر خرچ ہونے والے لامحدود مالی مسائل پر روک لگے۔اس سے قطع نظر یورپین اسکالر نے یہ کہنا شروع کردیا کہ غیر مہذب افریقیوں اور ایشیائی جاہلوں کو مہذب بنانا ہم سفید فام قوموں کا اخلاقی اور مقدس فرض ہے اور اس یقین کے ساتھ اس بات کو باور کرایا کہ تم غیر مہذب ہو، پس ماندہ ہو، ہم مہذب اور تم سے ہر اعتبار سے بہتر ہیں۔اسی

احساس سے مغلوب ہوکر لاڈ میکالے نے ۱۸۳۴ء میں کہا تھا کہ مشرق کے تمام علوم وفنون کے مقابلے میں ایک اوسط درجے کی یورپی لائبریری کی ایک الماری میں زیادہ علم ہے۔

یوروپ کوفخر تھا کہ ہماری تہذیب وثقافت دنیا کی تمام تہذیبوں اور ثقافتوں سے بہتر ہے۔ اس وجہ سے افریقی اور ایشیائی نوآبادیات کے لوگوں کو چاہئے کہ وہ ہمارے تہذیبی وثقافتی ورثے کو من وعن قبول کرلیں۔ ایسے متعصب نوآبادیاتی رجحان کی نمائندگی کرنے والوں میں سرالفریڈ لائل Sir Alfred Lyall تھے، جنہوں نے کہا تھا کہ ''مغربی ذہن نہایت مدلل ہے سائنس کی طرح وہ زندگی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے ، وہ حقائق کو قبول کرنے کیلئے ثبوت مانگتا ہے۔ مغربی ذہن میکانکی ہے اس کے مقابلے میں اورینٹل ذہن دلیلوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔ اورینٹل ذہن مشرقی شہروں کی گلوں کی طرح دائروں میں سفر کرتا ہے۔ اس کا منطق عجیب وغریب ہوتا ہے۔ اقبال یورپیوں کی فریب کاری وخودستائشی افکار کا تجزیہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

علامہ اقبال سرمایہ دارانہ نظام کے ظالمانہ اور استبدادی رویہ کے سخت مخالف تھے۔ وہ یوروپ کی سامراجی طاقتوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کے خواہش مند تھے۔ ایسا اس وجہ سے تھا کہ یہ نظام ایک جونک کی مانند تھا جو عوام کا خون چوس چوس کر خود تو موٹی تازی ہورہی تھی لیکن عوام بیچاری فاقہ کشی اور مفلوک الحالی کا شکار ہوکر جاں بحق ہورہی تھی۔ اقبال عمر بھر سرمایہ داری کے سفینہ کے ڈوبنے کے منتظر رہے اور اسی انتظار نے انہیں اس قدر خود فریبی میں مبتلا کردیا تھا کہ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ عیار ومکار سرمایہ دار اپنا تماشا دکھا کر چلا گیا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے کہ یوروپ کے میخانہ کے دستور نرالے ہیں۔ پہلے وہ بھولی بھالی عوام کو سرور میں لاتے ہیں اور اس کے بعد وہ انہیں مدہوش کردیتے ہیں۔ کل تک یہ سرمایہ دار Drain of wealth کے نظریے کے تحت نوآبادیوں کا خزانہ انگلینڈ میں بھر رہے تھے۔ آج بھی وہ یہ کام کررہے ہیں مگر کام کرنے کا طریقہ کچھ مختلف ہے۔ ان کا اصل مقصد تیسری دنیا کے وسائل پر قابض ہونا اور اپنی دولت کی طاقت سے ان کو غلام بنانا ہے۔ آج کثیر قومی کمپنیوں کے ذریعہ مقامی معیشتوں کو تباہ کرکے بڑی

کمپنیوں اور سرمایہ داروں کے لئے راہیں ہمواری کی جارہی ہیں ۔ دنیا میں یہ مفروضہ عام کیا جارہا ہے کہ غریب و مفلس وہ ہے جو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج غریب وہ ہے جو لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔

کثیر قومی کمپنیاں اپنی معاشی جارحیت کے ذریعہ غریب عوام کو لوٹنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ اس وجہ سے عوامی نفسیات اور ان کی ضروریات کے بدلتے رجحانات کو جاننے کے لئے تجارتی تجزیہ کار اور مارکٹنگ منیجرس کی تقرری کرتی ہیں۔ جنھیں پرکشش تنخواہوں پر اسی وجہ سے رکھا جاتا ہے کہ عوام کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کریں تاکہ اسی اعتبار سے مصنوعی ضروریات پیدا کی جائیں ۔ چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں پراڈکٹس کی ایک باڑھ سی آگئی ہے۔ کاسمیٹکس ، ڈبہ بند اشیاء، آرائشی سامان ، مشروبات ، اشتہاری دوائیں ، غیر ضروری کورسس ، میکڈانلڈ ، برستا وغیرہ جیسی مصنوعات کو فلک بوس ہورڈنگ کے ذریعہ مشتہر کیا جاتا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ صارف پیدا کیے جاسکیں اور ان غیر ضروری برانڈس کو خریدنے پر مجبور ہوسکیں۔

دوسری طرف عالمی معاشی ادارے جیسے عالمی تجارتی تنظیم ، عالمی بینک ، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ بھی سرمایہ دارانہ نظام کے مضبوط ہتکھنڈے ہیں۔ ان اداروں کی پالیسیاں ، پٹینٹ لاز Patent Laws اور انٹیلیکچول پراپرٹی رائٹس Intellectual Property Rights کے ذریعہ عوام کو غلام بنا رہی ہیں ۔ حکومتوں کو مالی امداد اور سودی قرض کے جال میں پھنسا کر حقوق انسانی کا گلا گھونٹتی ہیں ۔ یہ اقتصادی ادارے دنیا کے کم وبیش ممالک کے معاشی حکمت عملی میں بھی دخیل ہیں اور اپنے منافع کی خاطر ان کے معاشی فیصلوں میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے متعلقہ ممالک کی بنیادی ضرورتوں صحت عامہ اور تعلیم جیسے اداروں کو نجی بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں ۔ غذائی اشیاء میں سبسیڈیز اور کٹوتیاں کی جارہی ہیں ۔ مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے عالمی ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح سے سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ٹول اسپیشل اکنامک زونس SEZ ہیں ۔ اس کے تحت غریب اور مفلوک الحال کسانوں کی زمینوں کو کم معاوضہ کے عوض اکوائر کیا جاتا ہے ۔ جو ان کی معیشت کا معمولی ذریعہ ہوتی ہیں ۔ کسانوں کی زرخیز ، قابل کاشت زمینوں کو حکومت سرمایہ داروں کے حوالے کردیتی ہے اور حکومت اس بات

کا دعویٰ کرتی ہے کہ SEZ کسانوں کو بڑے پیمانہ پر روزگار مہیا کرائے گا اور یہ دعویٰ محض دعوے ہی رہتے ہیں اور مجبور کسان غریبی اور مفلسی کے دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ ادارے ہیں جو غریب کو ختم کرنے کے بڑے بڑے دعوتے کرتے ہیں۔ اصل میں وہ غریبی کو نہیں بلکہ غریبوں کو ختم کرتے ہیں۔ آزادی، مساوات، یکسانیت، اور جمہوریت کے نام پر دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں تا کہ ان کے تہذیبی و تاریخی وقار کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس کی تازہ ترین مثال افغانستان اور عراق ہے۔ جہاں کے معدنیاتی وسائل کو پانے کیلئے وہاں کے لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا گیا اور پوری دنیا میں گھوم گھوم کر یہ مشتہر کیا گیا کہ ان کا وجود عالم انسانیت کے لئے خطرہ تھا۔ اس وجہ سے ہم نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ اقبال اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

اکیسویں صدی جس میں جدید انسان سانس لے رہا ہے۔ عجیب ذہنی و تہذیبی پس ماندگی کا شکار ہے۔ اجتماعی مفادات پر ذاتی مفادات کا غلبہ، عدم سنجیدگی، علاحدگی، قدروں کی شکست وریخت اور نئے اقدار کی تلاش بھائی چارگی اور اخوت کا فقدان، رشتوں اور تعلقات میں سرد مہری، شارٹ ٹرم سوچ، فاسٹ فوڈ کلچر، روحانی اقدار اور مذاہب سے دوری Old age home , live in relationship فرسٹریشن، فحاشی کا غلبہ، حصول علم، برائے دولت جیسی غیر انسانی فکر نے عالمی معاشرتی نظام کو بد سے بدتر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ صارفیت کے بڑھتے رجحان نے ضروریات زندگی کے فطری نظام کو بری طرح متاثر کر دیا ہے۔ کیوں کہ آج Luxury کاریں، موبائیل سیٹس ایئر کنڈیشن، مہنگے زیورات، عالیشان مکان معیار زندگی کو طئے کرتے ہیں۔ اس رجحان نے عوام کو سودی قرض لینے اور خوب خرچ کرنے کی طرف مائل کیا ہے جس کی وجہ سے سودی نظام کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ پہلے زمانے میں سود خور غریب کسانوں اور مزدوروں کو قرضے دے کر سود کے نام پر ان کی زمین جائیداد ہڑپ کر جاتے تھے بلکہ ان کی بہو بیٹیوں کو بھی لے اڑتے تھے۔ آج آئی، ایم۔ ایف۔ اسی طرح کے غنڈوں کا کردار ادا کر رہا

ہے، وہ غریب ملکوں کے در پر پہنچتا ہے اور سودی قرض کے بدلے ان کی آزادی وخودمختاری چھین لیتا ہے۔ یہ سودی نظام سرمایہ داروں اور بڑی کمپنیوں کے مالکان کے لئے منفعت بخش تجارت بن گیا ہے جس کے ذریعے وہ غریب ممالک اور ان کی عوام کا خون چوس رہے ہیں۔ جس سے غریب عوام بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

سرمایہ دارانہ نظام نے گلوبلائزیشن کو دنیا پر تھوپ دیا ہے، جس کے تحت لبرلائزیشن، ڈیموکرائٹریشن اور پرائیویٹائزیشن کا نظریہ عمل میں آیا۔ جس کا اصل مقصد تھا تجارتی سطح پر ساری دنیا ایک ہو اور آزادانہ تجارت کے ذریعہ مغربی پروڈکس ساری دنیا میں حاوی ہو جائے۔ اس کا مطلب تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام پھر دنیا پر مسلط ہوگا۔ ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے ٹوٹنے اور سماج وادی خیموں کے کمزور ہونے سے اس طرح کے نظریے روبہ عمل میں آئے۔ ۱۹۹۱ء سے پہلے دنیا کا تعارف غریب ملک اور امیر کے ذریعہ ہوتا تھا۔ عالم کاری کے تحت ڈیجیٹل ڈیوائس کا تصور عمل میں آیا۔ اس ڈیجیٹل ڈیوائس کے تحت مغربی اسکالر یہ کہنے لگے کہ دنیا دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک دنیا وہ ہے جو جدید ٹکنالوجی وانفارمیشن سے بھری ہے اور دوسری وہ دنیا ہے جو صرف ابھی اس کا نام سنتے آرہے ہیں۔ اس طرح سے دنیا کے ممالک کا تعارف انفارمیشن سے متعین کیا جانے لگا۔ اس سوچ نے ای۔میل اور کیبل ٹی وی کو ایجاد کیا۔ آج انٹرنیٹ کے ذریعہ آپ خبروں کو دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں لیکن ان خبروں کے غلط اور صحیح کا فیصلہ آپ کے دست قدرت میں نہیں ہے۔ یہ مغرب طے کرے گا کہ کیا غلط اور کیا صحیح ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے ماضی کو اپنے مستقبل کی تفسیر کہا تھا۔ یہ فیصلہ ہم وقت کے ہاتھوں سونپ دیتے ہیں کہ آج کا جدید انسان اقبال کے خوابوں کی صحیح تعبیر پیش کر رہا ہے کہ نہیں، آج ہم جب دنیا کے معاملات پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا ایک بازار بن گئی ہے۔ جہاں انسان کے خونی رشتوں تک کو بھی یہ بازار ہی طے کرتے ہیں آج کا جدید انسانی انفارمیشن ٹکنالوجی کی چکاچوند میں اندھا ہوتا جارہا ہے۔ اب معیار زندگی کا اندازہ لوگ دولت سے لگاتے

ہیں ۔اس نظریے نے دنیا کے جوانوں کو پیتھالوجیکل ڈپریشن کا شکار بنادیا ہے جس کی وجہ سے دن بدن تشدد کے واقعات میں اضافے ہوتے جارہے ہیں ۔ یہ ترقی کی دوڑ حوصلہ افزا نہیں بلکہ مایوس کن ہے ۔اس خود ساختہ ترقی کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں ۔اس میں تضاد ہے ،جس کو اقبال نے بہت پہلے سوچا تھا۔ بظاہر خوش وخرم اور آسائش بھری زندگی ،فوری نتائج ، کامیابی ، منافع ، تیز ورک کلچر، پروفیشنلزم ،عمدہ کوالٹی حاوی محرکات ہیں ۔آج کا جدید انسان سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے انتہا پر ہے ۔آئے دن ہونے والے نت نئے اختراعات سے انسانی ذہن خیرہ ہے ۔گلوبل وارمنگ سے بڑھتی فضائی آلودگی کائنات کے فطری نظام کو چیلنج کر رہی ہے ۔اقبال کے فلسفی ذہن نے اپنے حال کی کیفیت سے دنیا کے حیرت انگیز مستقبل کا اندازہ کرلیا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

☆☆☆

IQBAL REVIEW

April 2011

English Section

Dr.Cihan Ozdemir

Portrayal of Turks and Turkey in Mohammad Iqbal's Works

Dr. Mohammad Iqbal (1877-1938) was a great poet, religious philosopher and political ideologist of the Indian Sub-continent(1).However, he was a cosmopolitan thinker whose thinking and writings were not confined to this Sub-continent only. Rather, he extensively wrote in his poems about many aspects of the socio-political and cultural lives of his time which existed beyond this region. In this paper I have tried to gather those ideas and thoughts of Iqbal which directly or indirectly portry Turks and Turkey of his time.I have not used Turkey to mean only the present-day Turkey, but also the Ottoman Empire (1299-1923), The predecessor of Turkish Republic which was created in 1923 by Mustafa kemal Ataturk.

Like every other thinker and philosopher, one can find the influence of various personalities on Iqbal through their writings, thinking and principles. Iqbal had been deeply influenced by the ideals of Mevlana Celaleddin 'Rumi'(1207-1273) a 13thcentury mystic poet of Konya, Turkey. One can find reference of Mevlana in Iqbal's writings on several occasions.Iqbal deeply admired Mevlana Rumi and chose him as his spiritual *guru*(master). Among the several writings referring to this aspect, I would like to mention about a book published in 1952, a few years after Iqbal's death , i.e. Rumi ve Iqbal.(2)we can, thus ,emphasize here Iqbal's relations with Mevlana and by this means with Turkey andTurkish culture.*Arzu*(Desire) and *khudi* (self) are Rumi's and Iqbal's main themes. I would also like to mention here that

because of Iqbal's excessive attachment with Mevlana,a symbolic tomb of Iqbal has been erected in the vicinity of Mevlana's mausoleum at Konya. Dust from Iqbal's real grave in Lahore was taken and buried just outside the entrance to Mevlana's own mezar (grave) ,with Iqbal's name written on the tombstone.

"I am but as the spark that gleams for a moment.
His burning candle consumed me-the moth;
His wine overwhelmed my goblet,
The master of Rum transmuted my earth to gold
And set my ashes aflame" (3)

Iqbal wrote many magnificent poems about Turkey and the Turkish people. Before dealing with those, let us briefly touch upon the historical context of that period particularly in our part of the world ,I mean Ottoman Empire/Turkey. His period was a period of social and political transformations not only from the context of the Sub-continent but also from the perspective of the Muslim wrold . He lived during a period which witnessed the downfall of a great Muslim empire, i .e, the Ottoman Empire because of various reasons including the onslaught of European imperialism.With Istanbul or Constantinople (*Kustuntuniya*) as its capital , the Empire had enjoyed its glory during the 16th -18th centuries. But by the begining of the20th century this great empire encountered multifarious difficulties from external as well as internal fronts.

It would also be important to take note of the fact that although Iqbal speaks about a variety of aspects , the portrayal of various people and region including those related to Turks and Turkey were primarily from the perspective of *ummah*.Iqbal essentially belongs to,and speaks from within,the Islamic tradion, employing for his purposes, the historical,religious,philosophical,and literary resources of that

tradition. Acutely aware of the problems of Muslim decadence and backwardness. Iqbal takes it upon himself to shake the Muslims of India and other countries out of their lethargy , urging them to take the path of progress , so that they can gain an honourable position in the polity of nations.He uses the medium of poetry to arouse socio-religious consciousness among Muslims.As a result, Islamic religious and social themes predominate in his poetry.

In a poem entitled" Mahasreh Adirneh"(Siege ofEdirne)(4) Iqbal vividly describes about moral greatness of Ottoman administration, particularly the primacy of moral justice. In this poem he illustrates the happening concerning the siege of the Ottoman city of Edirne in 1912.When the *Hissar* (fort) of Edirne was besieged by the forces of crusaders the commander of the Turkish (ottρman) forces.Sukri Pasa,(5) also declared war on the enemies. This besiegement inflicted severe economic and other miseries and people were encouraged to confiscate booties once the Ottoman armies regained their territories by forcing the invading forces to retreat. In this event the *Faqih* (6), of the city issued a *fatwa* to refrain from confiscating possessions of *dhimmi* or the non-Muslim people.

In the poem entitled" Bilad-e-Islamia" (Cities of the Muslim world) Allama describes about istanbul (kustuntuniya) along with other important cities like Delhi, Medina , cordoba (kartaba)et. He portrays this city as the heart of the Muslim world which was obtained with centuries of efforts. The city of Istanbul, which was the centre of the Kaiser /Byzantine Empire, epitomizes the symbol of Muslim /Islamic domination. Like the land of Kaba, this land is also holy , Iqbal tried to emphasize the importance of this centre by stating that this call was also coming from the grave of Hazrat Ayyub Ansar(7) who is buried in this land.

Lamenting on the loss of earlier glorious period of Muslim gains, Iqbal towards the valorous achievemtnets of Turks.

Kya sunata hai mujhe turk wa arab ki dastan
Mujh se kuch pinha nahin islamiyon ka soz o saz

Why are you tlling me the stories of turks and Arabs
Passion and creativity of Muslims are not hidden to me(8)

In the poem " Tulu -e-Islam "(The Rise of Islam) Iqbal,in two couplets,contextualizes the sacirifices of Ottomans and tries to convey his optimism for the rise of Islam despite its contemporary decline.He tries to inspire the whole Ummah and gives a wonderful example for arising of Islam. He says:

Rabudan Turk-e Shirazi dil-e Tabriz wa kabul ra
Saba Karti hai bo-e gul se apna safar payda

"If (beloved)Turk of Shiraz captured the heart of Tabriz and Kabul,forget it, because morning breeze (Saba) started the journey from the smell of flower and captured the whole garden.(9)

Here, I think Iqbal is trying to say that "if we want a renaissance of arise of Islam, Then no need to look for elite or kings, because as gentle wind captures the garden in the same way we can capture the whole world"

Agar Usmaniyon par koh-e gham tuta to kya gham hai
Ke khun-e sad hazar anjum se hoti hai sahar paida

Even if a mountain of sorrows oppressed the Osmanian, no need to worry about , because the blood of numerous stars will cause the dawn.(10)

Here the great poet says: if the Osmanian's dynasty collapsed ,there is no need to worry about , because we know that after numberless little stars devoting their blood the dawn is coming, The

same , if we want to arouse Islam we need to devote our blood like stars.

Regarding Turk-Arab relations, Iqbal was a bit critical of Turks by telling that the Turks did not care much of their unity and it would have been better if they had got mutual benefit from each other , In two couplets he says that:

Nadan the is qadar ke na jani Arab ki qadar
Hasil hua yahi, na bache maar pit se
Maghrib main hai jahaz-e Bayaban shutr ka,naam
Turkon ne kaam kuch na liya is fleet se
They were such ignorant that they didn't care about the Arabs
What they reaped is that they couldn't refrain from warngling
In the West the camel is renowned as the ship of desert
The Turks didn't gain anything from this fleet(11)

During the period when Ottoman Empire was succumb to its own dismemberment after the First World War and later the Turkish War of Independence , Muslims from the Sub-continent rendered great support. Once the Turkish Republic was created (1923) it was welcomed in this part of the world. However, the abolition of caliphate because of reforms of Mustafa Kemal Ataturk at later stage came as a shock to many Muslims of the Sub-continent. However, Muhammad Iqbal could take this as a striking augury for Muslim renaissance.

Iqbal Confidently praised Kemal When the Indian Muslim were themselves favourably disposed towards kemal .How did Iqbal view Mustafa Kemal Ataturk? How,in other words. did he react and respond to the changes being initiated in Kemalist Turkey ? On this subject , Iqbal expressed himself repeatedly and at great length,though not always in uniform terms. His final position is what he meintioned in his Reconstruction of Religious Thought in Islam. Our passage from

his lecture on The principle of Movement in the Structure of Islam .epitomises well his perception of the Turkish experience,and,there fore needs substantial reproduction.

The truth is that among the Muslim nations of today , Turkey above has shaken off its dogmatic slumber , and attained to self -consciousness. She alone has claimed her right of intellectual freedom , she alone has passed from the ideal to the real a transition which entails keen intellectual and moral stuggle. To her the growing complexities of a mobile and broadening life are sure to hiring new situations,suggesting new points of view , and necessitating fresh interpretation of principles which are only of an academic interest to a people who have never experienced the joy of spritual expansion... (M)ost Muslim countries today. are mechanically repeating old values , whereas the Turk is on the way to creating new valuese.He has passed through great experiences which have revealed his deeper self to him . In him, life has begun to move , change and ampilfy , giving birth to new desires, bringing new difficulties and suggesting new interpretations. The question which confronts him today, and which is likely to confront other Muslim contries in the near future is whether the law of Islam is capable of evolution a question which will require great intellectual effort, and is sure to be answered in the affirmative...(12)

The basic point in Iqbal's stand is that he was neither resigning himself to the fait accompli, nor was he offering a kind of an apologia for what was going on in Turkey . For him the only way to understand and appreciate the dynamism of theTrukish experiment was to develop on this problem a perspective which itself was not merely pragmatic but also dynamic. This indeed, was the way in which Iqbal viewed the measures suggested or taken in Ataturk's Turkey. The basic

achievement of Turkey,in his view,was that it had passed from the ideal to the real even though the experiment had tended to deny , in many ways , the vailidity of the ideal itself. Since Iqbal himself would reconsturct religious thought in Islam on the assumption that there was a need for such a reconstruction and that this enterprise would be in the nature of a departure from tradition,his position on theoretical grounds was,therefore,compatible,even synonymous,with that of the Kemalist Turk.There is thus,no reason why he should not have ,heartily welcome (d) the Liberal movement in modern Islam,(13) In fact, Iqbal hoped that the Indian Muslims,too one day,like Turks, would reevaluate their intellectual inheritance,and if were unable to make any positive contrubution,at least provide a healthy restraint on the rapid movement of Liberalism.(14)

It is important at this point to be clear about one thing: Iqbal's support for the Turkish experiment was unambivalent, but it was not unqualified. The fundamental clue to an understanding of Iqbal's Position is this : a vigorous and dynamic world-view was,for him,the prerequistite to this worldly salvation, of all the Muslim peoples, the Turk alone had shown this vigour, and had also shown what this vigour could lead to. To Iqbal, this was tremendous achievement. The inauguration of Islamic renaissance.But there also was some uneasiness in Iqbal' s mind . He complained:

The Turk has no new melody in his lute, His new is but Europe's old. Originality is at the root of all creation,Never by imitaion shall life be reformed."(15)

I would also like to highlight one important aspect of Iqbal 's use of various images and motifs in his portryal which may be interesting for us though it may not be relevant here in my paper .I also acknowledge that it may be only my perception and are not truly linked

to what Iqbal wanted to denote.Among his favorite images and motifs, on several occasions Iqbal used 'tulip' (lale) as metaphor, a flower probably originated in Anatolia and a famous symbol of Turks throught out their history . In the poem ' *Lala,i Sahra* ' (Tulip of desert) Iqbal says that the tulip is a pretty flower,but,when it grows in the dsert, it combines strength with beauty,for it then represents the assertion of one ' self *(khudi)*in the face of hostile circumstances. The tulip owes its splendor not to an outside source but to the ,"Scar"inside its heart, its glow being indigenous to it , as befits a flower with a khudi of its own. The tulip is thus becomes a "model'for individuals and nations to follow.

☆☆☆☆☆

References

*Visiting Professor: Jamia Millia Islamia, NewDelhi 10025, India. Email : Cihan_ozdemir@ hotmail.com

1. Though Iqbal's native place became Pakistan after his life time, he belonged to the entire region of South Asia which was then ruled by the British Empire. He was born at Sialkot in the Punjab on 9 November 1877 (his ancestors had migrated to Sialkot from Kasmir)and died on 21 April 1938 at Lahore at the age of sixty.

2. Rumi ve Ikbal . Pakistan Sefareti Basim Ataseligi Ankara & Istanbul , 1952. It was published with the support of the Embassy of Paksistan in Turkey at the occasion of 15th death anniversary of Iqbal.

3. Iqbal, Asrar i Khudi (transl. by Nicholson)

4.Edirne (Adrianople) is a city in western-most part of Turkey nearer to present-day Bulgaria and Greece. It was the capital of the Ottoman Empire during 1365-1453 before the conquest of Istanbul .

5. Gazi Sukri Pasa was the Ottoman commander. He proved his excellence during the Balkan wars. Once he defeated the advancing Bulgarian forces; but later he along with his forces were captured in Edirne. (Adrianople).

6. An expert on Islamic law.

7. Full name Abu-Ayyub Khalid bin Zaydul-Ansari . He was the person in whose house prophet Muhammad (Pbuh) stayed after he migrate (hijrat) to Medina from Macca . He died in Istanbul in 51 AH while fighting with the enemies.As per his will he was buried at a nearby place in Istanbul.

8. Kulliyat-e Iqbal(Urdu),Al-hastant Books Pvt.Ltd,New Delhi,2006,p.203

9.Kulliyat-e Iqbal(Urdu),Al-hastant Books Pvt.Ltd,New Delhi,2006,p.207

10.Kulliyat-e Iqbal(Urdu),Al-hastant Books Pvt.Ltd,New Delhi,2006,p.207

11.Kulliyat-e Iqbal(Urdu),Al-hastant Books Pvt.Ltd,New Delhi,2006,p.223

12. Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam (Lahore, 1971) , 162.

13. I bid, 162,

14. bid , 153

15. Muhammad Iqbal, Javid Nama, in kulliyat (ed)Ahmad Saroosh (Teheran, 1343A.H. (shamsi), 307

☆☆☆☆☆

1. M. Naeem qureshi (1996) Muslims of british India and the kemalist Reform in Turkey Iqbal, jinnah and ataturk . Jounal of ataturk research Centre Vol.12(35)

2. H. A. R . Gibb (ed) Whither Islam?(London, 1932)73.

3. W. C. Smith Modern Islam in India (Lahore , 1947) 169

4. Muhammad Iqbal.The Reconstruction of Religious Thought in Islam (Lahore , 1971) 162.

5. Muhammad Iqbal . Javid Nama, in Kulliat (ed) Ahmad saroosh (Teheran, 1343 A. H. (shamsi) 307

6.B. A. Dar, A study in Iqbal's Philosophy (Lahore 1971)140

7. 1S. A . Vahid (ed) Thoughts and reflections ofIqbal 371, cf . w. c. smith Islam in Modern History (Princeton, 1957)161

☆☆☆☆☆

Vol : 20 Issue : 1
April 2011

ISBN: 81-86370-48-x

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

April 2011

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY

Guishan-e-Khaleel, Masab Tank, Hyderabad - 28, A.P., INDIA.